وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ أَحْيَآءٌ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (القرآن)

اَلْاَنْبِيَآءُ أَحْيَآءٌ فِي قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ (الحدیث)

تَنْبِيْهُ الْاَغْبِيَاءِ
عَلٰى
حَيَاةِ الْاَنْبِيَاءِ

مؤلف:
حضرت مولانا سید امین الحق رحمۃ اللہ علیہ
خطیب جامع شیخوپورہ

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (الآیۃ)

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون (حدیث)

تَنْبِيهُ الْأَغْبِيَاء

عَلٰی

حَيَاةِ الْأَنْبِيَاء

مؤلفہ

مولٰنا سید امین الحق خطیب جامع شیخوپورہ

متوطن طورو ۔ ضلع مردان

(محررہ محمد عطاء اللہ حجرکانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفصیلی فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(حرفے چند)

حضرت مولانا سید امین الحق صاحب رحمہ اللہ

پیدائش: ۱۹۰۴ء ...... وفات: ۷ر ستمبر ۱۹۸۱ء

مولانا سید امین الحق صاحب طورو ضلع مردان کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے نامور شاگرد تھے۔ آپ شیخوپورہ کی مسجد قبرستان والی کے خطیب رہے۔ محکمہ اوقاف کے صوبائی خطیب تھے۔ آپ کا بیعت کا تعلق حضرت امام التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ سے تھا۔ آپ نے ۱۳۸۰ھ میں ''تنبیہ الاغبیاء فی حیات الانبیاء'' نامی کتاب لکھی، جسے اس مجموعہ میں شامل کرنے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ (ناشر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ امابعد!

جہاں تک میں جانتا ہوں عہد صحابہ تابعین اور سلف صالح کے زمانہ میں آرام گاہ نبوت میں رحمت کائنات ﷺ کی جسمانی حیات کا کسی نے انکار نہیں کیا ہے اور کسی وقت بھی ان نفوس قدسیہ کو اس اہم مسئلہ پر بحث و تالیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں آرام گاہ نبوت میں حضرت مصطفیٰ ﷺ کی حیات طیبہ کو دین کے بدیہیات میں حقیقت واقعی کے طور پر حضرات سلف نے تسلیم کیا تھا۔ لیکن جب سے ہویٰ وہوس کی اتباع اور دین کے مسلمہ اصول کے خلاف فتنوں کا آغاز ہوا ہے اس وقت کی پیداوار میں ایک عظیم فتنہ یہ بھی تھا کہ آرام گاہ نبوت میں فداہ ابی و امی ﷺ کا مقدس جسد بے جان مردہ پڑا ہے۔ اس میں حیات، حس اور شعور نہیں ہے اور اس فتنہ میں دوسرا قبیح تر حصہ یہ بھی شامل ہے کہ چونکہ روضہ اطہر میں رسالت مآب ﷺ کا بابرکت جسد بے جان پڑا ہے۔ اس لئے آپ کی نبوت اور رسالت بھی ختم ہوگئی۔ گویا حضور کی جسمانی حیات کا اس لئے انکار کیا گیا کہ اس فتنہ کے پیشواؤں نے دعوت نبوت کو چیلنج اور ابطال نبوت کا اعلان کرنا چاہا تھا۔

چنانچہ اس فتنہ انگیز نئے فرقہ سے ہم سب سے پہلے ابن حزم کی تحریر میں متعارف ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حزم لکھتے ہیں: کیا انبیاء و رسل علیہم السلام آج انبیاء و رسل نہیں رہے۔ ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ اب رسول اللہ ﷺ نہیں ہیں۔ لیکن وہ رسول اللہ ﷺ تھے اور مجھے سلیمان بن خلف الباجی نے جو آج ان لوگوں کے مقدمین میں سے ہیں۔ خبر دی کہ محمد بن الحسن بن فورک اصفہانی کا یہی عقیدہ تھا۔ جس کو محمود بن سبکتگین نے زہر دے کر قتل کر دیا اور اس فرقہ کا یہ خبیث عقیدہ اس کے اس فاسد نظریہ پر مبنی تھا کہ حضور کا جسد مبارک روضہ اطہر میں مردہ ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے آپ کی نبوت و رسالت باطل ہوگئی۔

(مختصر الملل والنحل ج اوّل ص ۱۶۳، اردو ترجمہ مولانا عبداللہ عمادی رکن سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن)

آپ جانتے ہیں کہ ۴۵۶، ۴۵۷ھ میں ابن حزم کی وفات ہوتی ہے اور ۴۲۱ھ میں محمود بن سبکتگین نے وفات پائی ہے اور سب سے پہلے امام بیہقی رحمہ اللہ نے عالم برزخ میں حضور ﷺ کی جسمانی حیات پر مستقل رسالہ لکھا اور حافظ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ نے امام بیہقی کی وفات کا سن ۴۵۸ھ لکھا ہے۔ اس لئے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ چوتھی صدی کے اواخر یا پانچویں صدی کے اوائل میں اس نئے فرقہ نے وہ نیا عقیدہ بنایا تھا کہ رسالت مآب ﷺ کا مقدس جسد بے جان مردہ ہے اور آپ کی نبوت اس لئے ختم ہوگئی ہے کہ متعارف موت سے آپ وفات پا چکے ہیں اور اس عہد سے محدثین اور خیرخواہان اسلام کو اس فرقہ کے اس خبیث عقیدہ کی تردید کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ کے علاوہ شیخ تقی الدین سبکی رحمہ اللہ اور حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اور سب کے آخر میں مولانا نانوتوی رحمہ اللہ قدس اللہ سرہ نے رسالت مآب کی جسمانی حیات پر اس قدر بسیط و بصیرت سے لکھا ہے کہ آج اس پر مزید اضافہ کی گنجائش نہیں ہے اور علم کلام کے ارباب تحقیق نے حضور ﷺ کی جسمانی حیات کو علم کلام کا اجماعی عقیدہ لکھا ہے۔ چنانچہ استاذ ابو منصور بغدادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔" ہمارے محققین اصحاب کلام نے لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنی مناسب

وفات کے بعد زندہ ہیں۔ اپنی امت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں۔ ابن حبیب فرماتے ہیں۔ جب آپ حضور ﷺ کے آرام گاہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو حضور ﷺ جانتے ہیں کہ آپ سامنے حاضر ہیں اور جب آپ بولتے ہیں تو حضور ﷺ آپ کی بات کو سنتے ہیں۔" (وفاء الوفاء لسید السمہودی ج ۴ ص ۱۳۵۴)

اور امام بیہقی رحمہ اللہ کتاب الاعتقاد میں لکھتے ہیں: انبیاء علیہم السلام اس کے بعد جب ان کی ارواح کو قبض کیا گیا سب کے سب قبض ارواح کے بعد زندہ کئے گئے ہیں۔ ان کی ارواح ان کے اجسام میں واپس لوٹائی گئی ہیں۔ (ایضاً)

اور امام بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں اس حدیث کی تخریج کی ہے کہ (انبیاء آرام گاہوں میں زندہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں) محدثین نے عالم برزخ میں رسالت مآب ﷺ کی جسمانی حیات کو نبوت کی علامات میں سے ایک علامت اور اسلامی عقائد میں اہم عقیدہ اور اہل سنت کے ضروری مسائل میں ایک لازمی مسئلہ قرار دیا ہے۔ ارباب حدیث کا اس قدر اہتمام کہ حضور ﷺ کی حیات جسمانی کو بحث و تالیف کا مستقل موضوع اور عقائد کا ضروری عقیدہ اور علامات نبوت کو اہم علامت رکھا ہے۔ آپ سوچئے کہ محدثین کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی جسمانی حیات کو عظیم الشان عقیدہ اور مہتمم بالشان مسئلہ کی حیثیت حاصل ہے اور جس شخص نے حضور کے آرام گاہ میں آپ کی جسمانی حیات کا انکار کیا اور حضور ﷺ کے جسد کے بے جان اور مردہ ہونے کا گمان کرتا ہے تو وہ محدثین کے علم وعقائد کا مزاحم ہوتا ہے اور اہل سنت والجماعت کے حصار سے الگ اور باہر ہوا چاہتا ہے۔

آپ یاد رکھئے کہ محدثین اور اصحاب سنن کی یہ مبلغانہ کوششیں صرف روحانی حیات کے اثبات کے لئے نہیں ہیں۔ اس لئے کہ روح کی حیات اور موت کی بحث نہیں تھی بلکہ اس گمراہ فرقہ کا یہ دعویٰ تھا کہ حضور ﷺ کا جسد پاک روضہ اطہر میں بے جان مردہ ہے محدثین اس فرقہ کی تردید میں حضور ﷺ کے جسد مبارک کو روضہ اطہر میں زندہ جاوید اور سننے اور جاننے والے ثابت کرتے ہیں اور اس جسمانی حیات کو ضروری عقیدہ اور علامات نبوت میں لازم علامت قرار دیتے ہیں۔ بیہقی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت میں صراحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ قبض ارواح کے بعد انبیاء کے اجسام میں ان کی ارواح واپس لوٹائی گئی ہیں اور یہی جسمانی اور دنیاوی زندگی ہے کہ روح جسم کے اندر ہے اور اس میں تدبیر وتصرف کرتی ہے۔

اہل حق کی مخلصانہ تبلیغی مساعیوں نے ایک عرصہ ہوا کہ اس عقیدے کے پیروکاروں کو ختم کر دیا تھا یا اس تحریک کا چلانے والا کہیں سننے میں نہیں آتا تھا کہ ملتان کے کسی اعانتی جلسہ میں ایک صاحب کی زبان سے اس دعویٰ کا اچانک آغاز ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے اجساد اگرچہ قبروں میں محفوظ ہیں۔ مگر ان میں زندگی نہیں ہے اور اگر کچھ زندگی ہے تو صرف اس قدر جو عام اموات کو برزخ میں روحانی زندگی ہوتی ہے۔ چونکہ برزخ میں انبیاء کی ارواح کی حیات کا اقرار کرنا اور ان کے اجساد سے ان کی ارواح کو دنیا کی حیات جیسے تعلق سے الگ اور بے تعلق بتلانا اہل سنت اور جمہور سلف کا مسلک نہیں ہے بلکہ اعتزال کی راہ ہے۔ اس لئے اہل حق نے اس قسم کے ادّعاء کو تحریر وتقریر میں نفرت سے پڑھا اور کراہت سے سنا ہے۔ اس لئے کہ اہل حق بدن کے ساتھ یا قبر کے ساتھ روح کے اس قسم کے تعلق اور اتصال کو جیسے کہ شعاع شمس کو جو زمین پر پڑتے ہیں۔ زمین کے ساتھ اتصال ہے اور اصل شعاع شمس کے ساتھ متصل ہیں حیات نہیں جانتے ہیں بلکہ یہ کہا ہے کہ بدن کی حیات روح کے اس اتصال کا نام ہے جیسا کہ دنیا کی زندگی میں روح کو اس کے بدن کے ساتھ تعلق اور اتصال ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالرؤف مناوی رحمہ اللہ جامع صغیر کی

شرح میں لکھتے ہیں: ''ہر ایک روح کو اس کے بدن کے ساتھ ایسا معنوی اتصال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حالت حیات کے اتصال کے مشابہ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ایسا اتصال ہے جیسے کہ نائم کی روح کو نائم کے جسد کے ساتھ نوم کی حالت میں ہوتا ہے۔ اگرچہ نائم کی روح اس کے جسد سے باہر اور الگ ہے۔'' (فیض القدیر ج ۲ ص ۳۹۸)

مذکورہ ادّعاء میں انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو ان کے اجساد کے ساتھ عام اموات کی ارواح اور اجساد کے معنوی اتصال کی طرح فی الجملہ اتصال بتلایا گیا ہے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ انبیاء بھی عام اموات کی طرح اپنی قبروں میں مردہ ہیں اور اہل حق اس کو مبتدعانہ گمراہی سمجھتے ہیں۔ البتہ ہمارے زمانہ کے اصطلاحی اہل حدیث مذکورہ ادّعاء کے ہمنوا ہیں۔

اس لئے مولوی محمد اسماعیل صاحب نے مذکورہ ادعاء کی تائید میں تین قسطوں میں اپنے فرقہ اہل حدیث کی نمائندگی کرتے ہوئے رحیق رسالہ شعبان، رمضان، شوال ۱۳۷۷ھ میں اپنی بحث کو شائع کر دیا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریر میں پیغمبرانہ حیات کے ایک ایک پہلو پر بالتفصیل مخالفانہ مزاحمت کی ہے اور دل کھول کر اہل حق پر سوقیانہ چوٹیں کی ہیں اور بڑی بے رحمی کے ساتھ قریب بہ تحریف تاویلات کا دروازہ کھولا ہے اور سلف اور حفاظ حدیث کی طرف ان کی نامرضیات کے منسوب کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ اس لئے میں مولوی محمد اسماعیل صاحب کی تحریر کو سامنے رکھ کر آپ کے دفاع کو تین عنوانوں پر تقسیم کرتا ہوں۔

(۱) عام اموات کی برزخ میں زندگی (۲) شہداء کی زندگی (۳) انبیاء کی جسمانی حیات۔ تاکہ برزخ میں عام اموات کی زندگی کے سمجھ لینے کے بعد برزخ میں شہداء کی زندگی کے تفصیل کے بعد انبیاء علیہم السلام کی جسمانی حیات کی خصوصیت اور امتیاز کے سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو جائے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب!

برزخ میں عام اموات کی زندگی

سنن وآثار اور اہل علم کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم اجساد کے بعد اور عالم آخرت سے پیشتر عالم برزخ میں موت کے بعد عام اموات کے اجساد کے ساتھ ان کی ارواح کو حسب مراتب تعلق ہے اور ضرور تعلق ہے۔ چنانچہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جمعہ کے دن اموات کی ارواح ان کی قبروں کے قریب اور متصل ہوتی ہیں اور جو ان کی قبروں کی زیارت کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر گزرتے وقت ان کو سلام کرتے ہیں تو ان کی ارواح ان کو جانتی اور پہچانتی ہیں۔'' (زاد المعاد ج اوّل ص ۱۴۴)

سید سمہودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: احکام صغریٰ میں شیخ عبد الحق نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ سند اس کی صحیح ہے اور ابن عبد البر رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ رسالت مآب نے فرمایا اپنے مومن بھائی کی قبر پر جو گزرتا ہے اور وہ میت اپنی حیات میں اس کو جانتا تھا اور اس کو سلام کرتا ہے تو وہ میت اس کو جانتا ہے اور اس کے سلام کا اس کو جواب دیتا ہے۔

اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو ذیل کے الفاظ میں روایت کیا ہے: جو آدمی کسی کی قبر پر گزرتا ہے اور وہ اس کو دنیا میں جانتا تھا اور اس کو سلام کرتا ہے تو میت کی روح کو حق تعالیٰ اس کو لوٹا دیتا ہے اور وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کے لئے جو حاضر ہوتا ہے اور اس کے پاس بیٹھتا ہے تو وہ میت اس کے واپس ہونے تک اس سے انس لیتا ہے۔

اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اقتضاء الصراط المستقیم میں ذکر کیا ہے کہ شہداء بلکہ تمام ایمان والوں کا یہ حال ہے کہ جب کوئی مسلمان ان کی قبر کی زیارت کرتا ہے تو وہ اس کو پہچانتے ہیں اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور جب آحاد مؤمنین کا یہ حال ہے تو سید المرسلین ﷺ کا کیا حال ہوگا۔ (وفاء الوفاء ص ۱۳۵۱)

مرنے کے بعد آحاد مؤمنین کو جب اس قدر حیات دی جاتی ہے کہ وہ سلام کرنے والے کو پہچانتے ہیں اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں اور اس کے سلام کو سنتے ہیں تو پھر حضور ﷺ کے علو درجات اور مراتب کی بلندی کی نسبت سے آپ کی حد کہاں ہے اور کہاں تک ہونی چاہئے۔

حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا کہ مردوں کی قبروں میں ظلمت در ظلمت ہے۔ ان پر میری نماز جنازہ کی برکت سے حق تعالیٰ ان کی قبروں کو ان پر روشن اور منور فرماتے ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الجنائز، سنن کبریٰ ج ۴ ص ۴۶)

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ میت کی روح کو اس کے جسد کے ساتھ اس قدر تعلق ضرور ہے۔ جس نے میت میں اس درجہ حیات کو پیدا کر دیا ہے کہ وہ قبر میں نور اور روشنی کو محسوس کرتا ہے اور میت پر اس کا اثر پڑتا ہے ورنہ بالکل بے جان اور مردہ لاش کو روشنی اور ظلمت دونوں برابر ہیں۔

قبر میں نعمتیں ہوں گی یا عذاب ہوگا

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کیا قبر میں نفس اور بدن دونوں کو عذاب ہوتا ہے یا صرف نفس یا صرف بدن کو عذاب ہوگا۔ شیخ الاسلام غالباً حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: کہ اہل سنت والجماعت کو اتفاق ہے کہ برزخ میں نفس اور بدن دونوں کو عذاب ہوگا یا دونوں نعیم میں ہوں گے اور معتزلہ اگرچہ بعثت کے وقت ابدان کے معاد کا اقرار کرتے ہیں مگر برزخ میں صرف روح کے لئے نعیم یا عذاب کو تسلیم کرتے ہیں اور ابن حزم اور ابن مرہ کو بھی معتزلہ کے ساتھ اتفاق ہے۔ (کتاب الروح ص ۷۹)

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ برزخ میں عذاب کی بحث میں لکھتے ہیں: قبر میں فتنہ اور عذاب صرف روح کو ہوگا اور جسم سے روح کے الگ ہوجانے کے بعد صرف روح کو عذاب اور سوال ہوگا اور یہ جو گمان کیا جاتا ہے کہ میت کو اس کی قبر میں زندہ کیا جاتا ہے تو یہ غلط ہے اور کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ مردوں کی ارواح ان سے سوال کے وقت ان کے اجسام میں واپس کردی جاتی ہیں اور حدیث میں یہ جملہ کہ ارواح اجسام کی طرف پلٹتی ہیں۔ صرف منہال بن عمرو نے روایت کیا ہے۔ مگر منہال قوی نہیں ہے۔ شعبہ وغیرہ نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔ (الملل والنحل ج ۲ ص ۷۱۵)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس بحث میں ابن حزم رحمہ اللہ کا تعاقب کیا ہے اور خوب تعاقب کیا ہے۔ ابن حزم کی وجوہات کو مسترد کردیا ہے اور اہل سنت والجماعت کے مسلک کو واضح اور ثابت کردیا ہے کہ میت کو اس کے جسم میں اس کی روح واپس کردی جاتی ہے۔ مولوی اسماعیل صاحب نے بھی ابن قیم کی اس بحث سے اس قدر حصہ نقل

کر دیا ہے جس کو اہل سنت والجماعت کے مسلک میں شبہ اور مغالطہ ڈالنے کے لئے مفید جانتے تھے۔ میں ابن قیم رحمہ اللہ کے علم ونظر سے استفادہ کے لئے پوری بات نقل کرنا چاہتا ہوں۔

ابن حزم کی بات نقل کرنے کے بعد ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اگر ابن حزم کی غرض یہ ہے کہ مردوں کو قبر میں ایسی حیات، ہے جیسی کہ دنیا میں ان کی زندگی تھی کہ روح جسم میں تدبیر اور تصرف کرتی ہے اور جسم کھانے پینے اور پہننے کا محتاج ہوتا ہے تو واقعی یہ غلط ہے۔ قبروں میں اموات کو ایسی زندگی حاصل نہیں ہے اور اگر قبروں میں اموات کی ایسی زندگی مراد ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کے علاوہ دوسری قسم کی ایسی زندگی ہے جس میں روح کا اعادہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ اعادہ پہلے اعادہ کی طرح نہیں ہے۔ جیسا کہ دنیا کی زندگی میں پہلا اعادہ تھا کہ حیات کی پوری ضروریات اور لوازمات اس کے ساتھ آئی تھیں تو قبروں میں ایسی زندگی کی نفی کرنا جیسا کہ ابن حزم نے کیا غلط ہے۔ (اس لئے کہ اموات کو قبروں میں ایسی زندگی ضرور ہے) صریح اور صحیح ہے۔ نص سے یہ ثابت ہے کہ میت کی روح اس کے جسم میں پلٹتی ہے۔ اگر ابن حزم اس حدیث کو ضعیف بتلاتے ہیں تو ہم اس کا جواب ذکر کرتے ہیں۔ اس حدیث میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد "ثم تعاد روحه في جسده" صریح دلالت کرتا ہے کہ میت کے جسم میں اس کی روح لوٹتی ہے۔ میت کی روح میت کے جسم کے ساتھ متعلق رہتی ہے۔ اگر چہ اس کا جسم گل جائے اور ریزہ ریزہ ہوجائے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بدن کے ساتھ روح کے پانچ قسم کے تعلقات ہوتے ہیں اور ہر ایک تعلق کے احکام دوسرے تعلق کے احکام سے بدلے ہوئے ہیں۔

پہلا تعلق جبکہ جنین ماں کے پیٹ میں تھا۔ دوسرا تعلق جبکہ وہ باہر کی دنیا میں آیا ہے۔ تیسرا تعلق نیند کی حالت میں کہ نائم کی روح من وجہ اس سے الگ ہے اور من وجہ تعلق ہے۔ چوتھا تعلق برزخ میں اگر چہ میت کی روح اس سے الگ ہے مگر یہ جدائی اس حد تک نہیں ہے کہ روح کو اپنے جسم کی طرف بالکل التفات نہیں ہے۔ پانچواں تعلق بعث اجساد کے دن کا ہے اور یہ کامل اور پورا تعلق ہے اور یہ زندگی ایسی ہے جس میں موت وفساد کا امکان نہیں ہے اور اعادہ روح کے بعد میت کی حالت زندہ اور اس میت کے درمیان درمیان ہے۔ جس کی روح اس کے بدن میں نہیں واپس کی گئی ہے۔ جیسا کہ نائم کا حال زندہ اور میت کے درمیان درمیان ہے۔ (کتاب الروح ص ٦٦)

اور ابن حزم کو جواب دیتے ہوئے ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ میت کو روح کا اعادہ سلام کے جواب کے لئے یا دوسرے مخصوص اوقات میں خاص اور عارضی اعادہ ہے۔ بدن کی حیات اور بدن میں معتد بہا اور مستقل حیات اس سے ثابت نہیں ہوتی ہے اور ایسی عارضی اور مخصوص وقت میں ایک لحظہ کی حیات آیت امساک نفس اور آیت امتنا اثنتین کی منافی اور منفی نہیں ہے۔ ابن حزم کی مجازفت ہے۔ ورنہ جس حدیث پر اس کو اعتراض ہے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ حضرت زاذان کے علاوہ اس حدیث کو عدی بن ثابت، محمد بن عقبہ اور مجاہد نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن مندہ نے کتاب الروح والنفس میں عدی بن ثابت عن براء بن عازب اور مجاہد عن البراء بن عازب کی حدیث کے آخر میں مرفوعاً یہ استشہاد مذکور ہے "منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى" (طٰہٰ:۵۵) ترجمہ (اس زمین سے ہم نے تم کو بنایا اور اسی میں تم کو پھر پہنچا دیتے ہیں اور اسی سے دوسری بار تم کو نکالیں گے) ابن قیم کہتے ہیں یہ حدیث ثابت ہے مشہور ہے۔ حفاظ کی جماعت نے اس کو صحیح بتایا ہے اور میں ائمہ حدیث میں کسی صاحب کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث پر طعن کیا ہے۔ بلکہ اس حدیث کو ائمہ حدیث نے قبر کے عذاب اور نعیم میں دین کے اصول میں قرار دیا

ہے۔ حضرت زاذان ثقہ ہے اکابر صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔ مسلم اپنے صحیح میں اس سے روایت لیتے ہیں۔ یحییٰ ابن معین اس کو ثقہ کہتے ہیں اور منہال ابن عمر عادل ثقہ ہے۔ ابن معین اور عجلی اس کو ثقہ کہتے ہیں۔ (کتاب الروح ص ۴۷، ۵۷)

حافظ ابن مندہ کے علاوہ حافظ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ اور حاکم نے مستدرک میں بھی اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے اور دونوں حضرات حفاظ نے یہ لکھا ہے کہ زاذان اور براء بن عازب کے درمیان ابی البختری طائی کا ذکر صرف شعیب بن صفوان کرتے ہیں۔ مگر شعیب کو یہ وہم ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ائمہ ثقات کو عن زاذان انہ سمع البراء پر اتفاق ہے۔ اس میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ ”فترد روحه الی جسده“ (مستدرک حاکم ج اول ص ۳۹)

ابن قیم کہتے ہیں: شیخ الاسلام غالباً حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سوال کے وقت روح کا اعادہ کرنا احادیث صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے اور ابن مرہ اور ابن حزم کا یہ کہنا کہ صرف روح سے سوال ہوگا غلط ہے۔ احادیث اس کا انکار کرتی ہیں۔ اگر صرف روح سے سوال ہوتا ہے تو قبر کو روح کے ساتھ اختصاص نہ ہوتا۔ (کتاب الروح ص ۷۹)

بہر حال براء بن عازب کی مذکورہ حدیث صحیح اور ثابت ہے اور میت کی طرف روح کا اعادہ صحیح احادیث کا منطوق ہے۔ بلکہ براء بن عازب کی حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میت سے اللہ کا وعدہ تھا کہ اس کی روح اس کو اعادہ کیا جائے گا اور حضور رسالت مآب ﷺ کا اس وعدہ خداوندی پر قرآن شریف کی آیت ”منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرىٰ“ سے استشہاد فرمانا ثابت کرتا ہے کہ میت کی طرف روح کے اعادہ کا مسئلہ قرآن شریف میں بھی مذکور ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میت اپنے واقف گزرنے والے کو پہچانتا ہے اور سلام کرنے والے کے سلام کا جواب دیتا ہے اور اس کے پاس بیٹھنے سے انس لیتا ہے۔

غرض یہ کہ میت کو قبر میں زندگی دی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ عارضی اور موقت غیر مستقل زندگی ہے اور یہ کہ میت کے جسم کے ساتھ اس کی روح کا اس قدر تعلق اور اتصال ضرور ہے کہ گزرنے والے کو جانتا اور پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور اس کے پاس بیٹھنے سے انس لیتا ہے۔ اگرچہ میت کے جسم میں اس کی روح موجود نہیں ہے۔ لیکن جیسے آفتاب لاکھوں میل سے شعاعوں کے ذریعہ سے زمین کو گرم رکھتا ہے۔ اسی طرح روح کے الگ ہونے کے باوجود بھی اپنے جسم میں وہ اس قدر حیات اور شعور کو باقی اور قائم رکھتی ہے۔ جس قدر کہ احادیث میں مذکور ہوا ہے۔ جسم میں اس قدر حیات اور شعور کے اعتراف کے باوجود بھی کتاب وسنت میں کہیں بھی یہ مذکور نہیں ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں عام اموات مؤمنین زندہ ہیں یا ان کو زندگی دی گئی ہے اور دین کے عمائد محدثین اور فقہاء بھی قبروں میں ان کی زندگی کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ روح کے اس فی الجملہ تعلق واتصال اور ایک گونہ فی الجملہ حیات کو کتاب وسنت اور فقہاء ومحدثین نے حیات اور زندگی نہیں سمجھا ہے بلکہ درحقیقت زندگی یہ ہے کہ اس فی الجملہ حیات اور اتصال کے علاوہ روح کو جسم کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے جیسا کہ دنیا کی زندگی میں روح کو اپنے جسم کے ساتھ تدبیر اور تصرف کا تعلق تھا۔

لہٰذا جب کتاب اور سنت میں شہداء اور انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عالم برزخ میں زندہ کہا گیا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ عالم برزخ میں عالم برزخ کے مناسب شہداء کے حسب مراتب اور انبیاء علیہم السلام کو ان کے مناسب شان ایسی جسمانی حیات بخشی گئی ہے جیسا کہ دنیا کی زندگی میں ان کی جسمانی زندگی دیکھی گئی تھی اور جب

امت کے ائمہ حدیث نے عالم برزخ میں سرور کائنات کی حیات سے بحث کی ہے اور اس کو دین کا اہم عقیدہ تسلیم کیا ہے تو ان کی مراد یہ ہے کہ دنیا کی حیات جیسی حیات میں آپ عالم برزخ میں حیات ہیں اور اگر کتاب وسنت اور محدثین کی بحث واثبات میں انبیاء علیہم السلام کی اس قدر حیات مراد ہے جس قدر عام اموات مؤمنین کو روح کے کسی قدر تعلق سے فی الجملہ اور ایک گونہ حیات حاصل ہوتی تو کتاب وسنت میں اور ائمہ دین کے مباحث میں ان کی حیات کو مخصوص بالذکر کرنے کا کچھ معنی نہیں ہے۔

محدثین اور اہل علم کی بحث کا موضوع جسمانی حیات ہے

بدرالدین ابن الصاحب فرماتے ہیں: عالم برزخ میں حضور ﷺ کی زندگی قرآن شریف کی اس آیت سے بھی ثابت ہے "ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون" (آل عمران: ۱۶۹) ترجمہ: اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے ہیں اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے ہیں (اس لئے کہ ان کو زندگی بخشی گئی ہے اور مارے جانے کے بعد وہ زندہ ہیں اور ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اور ان کا رب تمہیں ان کی حیات کی خبر دیتا ہے۔ ان کے رب نے ان کو ایسی زندگی بخشی ہے جس میں وہ کھاتے پیتے ہیں)

برزخ میں موت کے بعد شہداء کو زندگی دی گئی ہے اور جن کو برزخ میں یہ رتبہ اور مقام حاصل نہیں ہے۔ ان سے شہداء اعلیٰ اور افضل ہیں اور امت میں چونکہ رسالت مآب ﷺ سے کسی کا مقام اور رتبہ اعلیٰ اور اونچا نہیں ہے۔ بلکہ شہداء کو بھی یہ رتبہ حضور ﷺ کی اتباع اور اطاعت وحرمت کے صلہ میں ملتا ہے۔ اس لئے شہداء کی حیات سے اعلیٰ اور افضل زندگی نبی کریم ﷺ کو حاصل ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا میں اسریٰ کی رات سرخ رنگ کے ٹیلہ کے پاس سے گزرا تو میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

اس حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جسمانی حیات کی تصریح ہے۔ اس لئے کہ اس حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک صفت صلوٰۃ کو اور دوسری صفت قیام کو اور تیسرا حال قبر میں بیان کیا گیا ہے اور ظاہر متبادر یہ ہے کہ صرف روح قیام وصلوٰۃ سے موصوف نہیں ہو سکتی ہے اور نیز قبر کی تخصیص بھی روح کے لئے ناممکن ہے بلکہ یہ تمام اوصاف اور مذکورہ حال جسد کے ہیں اور روح کے لئے قبر کی تخصیص میں ایسی نامعقول بات نہ کسی نے کہی ہے اور نہ کوئی کہے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح اپنی قبروں میں اپنے اجساد کے ساتھ محبوس ہیں اور شہداء یا مؤمنین کی ارواح آزاد ہیں جہاں چاہتی ہیں سیر کرتی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم حضور ﷺ کے ہم رکاب جا رہے تھے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ہم ایک وادی پر گزرے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ کون سی وادی ہے۔ جواب میں کہا گیا یہ وادی ارزق ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں نے یونس علیہ السلام کو سرخ ناقہ پر سوار، صوف کا جبہ پہنے ہوئے اور تلبیہ پڑھتے ہوئے اس وادی میں گزرتے ہوئے دیکھا۔

یہ تمام اوصاف ناقہ پر سواری، جبہ کا پہننا اور گزرتے ہوئے نکل جانا۔ جسم کے اوصاف ہیں جو اس حدیث میں بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ برزخ عمل اور عالم تکلیف نہیں ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کو عمل کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے اور عبادت کرنے کو اللہ کا انعام سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے عمل بڑھاتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں اور جب تک قیامت اور جزاء کا دن نہیں آیا ہے تو اس اعتبار سے وہ اس دنیا میں ہیں اور ان کا عمل ابھی ختم نہیں ہوتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے جسد اور روح دونوں میں زندہ ہیں اور زمین وملکوت کے اطراف میں جہاں چاہتے ہیں سیر فرماتے ہیں اور اس حال اور اس حال میں جو وفات سے پہلے تھا صرف اس قدر تبدیلی آئی ہے کہ ہماری نگاہوں سے آپ غائب ہیں جیسا کہ ملائکہ اپنے مناسب اجسام میں زندہ ہیں۔ مگر ہم ان کو نہیں دیکھتے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی پر لطف فرماتے ہیں تو حجاب کو اٹھا دیتے ہیں اور اس کو حضور ﷺ کی زیارت کا شرف بخشتے ہیں اور حضور ﷺ کو سابق ہیئت پر وہ دیکھتا ہے۔ اس سے کوئی شرعی دلیل مانع نہیں ہے اور رویت مثالی کی تخصیص کے لئے کوئی داعی نہیں ہے۔ (الحاوی ج ۲ ص ۲۶۴)

اور زرقانی مالکی لکھتے ہیں: انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں ایسی نماز پڑھتے ہیں کہ جس طرح کی نماز دنیا کی زندگی میں پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ جزاء کے دن تک دنیا میں اور عبادت کے عالم میں ہیں۔ آپ عالم برزخ کو عالم تکلیف نہ سمجھئے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ برزخ میں بھی اللہ کی عبادت میں وہ انعام اور لذت محسوس کرتے ہیں اور دنیا کی زندگی کی طرح زیادہ سے زیادہ عمل کے بڑھانے میں حق تعالیٰ سے اپنے قرب کو زیادہ بڑھاتے ہیں اور قبروں میں ان کی نماز پڑھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے اجسام زندہ ہیں اور ان کی زندگی حقیقی جسمانی زندگی ہے۔ قرطبی کو بھی اس کا یقین ہے۔ (زرقانی ج ۶ ص ۳۰ و ج ۵ ص ۳۳۲)

اور حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیآء عند ربھم یرزقون" (آل عمران: ۱۶۹) کے عموم میں انبیاء علیہم السلام داخل ہیں اور عالم برزخ میں انبیاء علیہم السلام حیات اور رزق کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب شہداء سے بدرجہا بلند ہیں اور شہادت کے مقام سے نبوت بمراتب بلند ہے۔ ہر ایک نبی علیہ السلام کی نبوت کے ساتھ شہادت بھی اس کی صفت ہے۔ امام احمد ابو یعلیٰ، طبرانی، حاکم، بیہقی نے دلائل النبوۃ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نو دفعہ قسم کھانے کو ایک دفعہ قسم کھا کر کہنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ شہید کر دیئے گئے تھے۔ "وذالک بان اللہ عزوجل اتخذہ نبینا وجعلہ شھیدا" (مسند احمد حدیث نمبر ۳۶۱۷)

اور (مسند احمد حدیث نمبر ۳۸۷۳) میں عبدالرزاق کے طریقہ میں یہ ہے: کہ میں نو دفعہ قسم کھا کر یہ کہہ دوں کہ حضور ﷺ شہید کئے گئے تھے۔ ایک دفعہ کے قسم کھا کر کہنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ شہید نہیں کئے گئے۔ "وذالک بان اللہ جعلہ نبیاً واتخذہ شھیدا" اسی طرح حاکم نے کتاب المغازی میں روایت کیا ہے۔ (ج ۳ ص ۵۸) اللہ نے حضور ﷺ کو نبوت بخشی ہے اور شہید بنایا ہے۔

حضور ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ فی سبیل اللہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہود نے خیبر کے دن کھانے میں آپ کو زہر دیا تھا اور اخیر میں اس کے اثر سے آپ کی شہادت ہوگئی ہے۔ بخاری نے فی باب مرض النبی ﷺ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: حضور فرماتے ہیں میں نے خیبر میں جو زہر آلود کھانا کھایا تھا اس کا اثر ہمیشہ محسوس کرتا رہا اور اب تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے میری شہ رگ کو کاٹ دیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ آرام گاہ نبوت میں حضور ﷺ کی زندگی کے لئے قرآن کی نص آیت کا عموم اور آیت کا مفہوم دلائل ہیں۔ (الحاوی ج ۲ ص ۱۴۸)

شیخ تقی الدین سبکی فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام اور شہداء کی حیات قبر میں ایسی ہے جیسی کہ دنیا میں ان کی زندگی تھی؛ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضور ﷺ نے قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور قبر میں نماز پڑھنے کا تقاضا یہ ہے کہ قبر میں آپ کا جسم زندہ ہے اور اسی طرح وہ دوسری صفات جن کو حضور ﷺ نے لیلۃ الاسراء میں انبیاء علیہم السلام کی ملاقات کے بعد ذکر فرمایا ہے تمام اجسام کے صفات ہیں۔ (الحاوی ج ۲ ص ۱۵۲)

اور شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں: امت مسلمہ کے علماء کو انبیاء علیہم السلام کی حیات پر اتفاق ہے۔ ایک امت کے علماء میں پانچ افراد کو بھی اس میں اختلاف نہیں ہے۔ انبیاء کی حیات حسی اور دنیاوی ہے۔ احادیث اور آثار سے ان کی اس قسم کی حیات ثابت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی حیات مجرد لقاء ارواح کی قسم سے نہیں ہے۔ جیسے کہ شہداء کو جوف طیور میں زندگی حاصل ہوتی ہے۔ (مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۵۷۶)

خلاصہ یہ کہ امت کے علماء کو حضور ﷺ کی جسمانی اور دنیا کی حیات کی طرح عالم برزخ میں حیات پر اتفاق ہے۔ اگر کسی نے کچھ اختلاف کیا ہے تو ان کی تعداد پانچ تک بھی نہیں پہنچتی ہے وہ گنتی میں نہیں ہیں اور سلف وخلف کے علماء کو قرآن شریف کی آیت اور احادیث وآثار کی روشنی میں حضور کی جسمانی حیات پر یقین ہے اور ان کی بحث کا موضوع جسمانی حیات ہے اور روحانی حیات سے ان کی بحث کا کچھ تعلق نہیں ہے۔ اس لئے مولوی اسماعیل صاحب کا یہ لکھنا کہ شیخ عبدالحق اور مولانا حسین احمد مدنی نے جسمانی حیات کی یہ مصیبت کہاں سے خریدی ہے۔ باطنی کھوٹ اور ہویٰ پرستی کے جنون میں احادیث نبویہ کا اعراض اور حضرات سلف کے علماء کے استفادات سے انکار کرنے اور دور رہنے کی بیماری ہے۔ کتاب وسنت میں حضرات سلف کے علماء کی صواب دید بصیرت کی علمی دولت نے شاہ عبدالحق اور مولانا مدنی کو اس علم وعقیدہ کی طرف صحیح رہنمائی کی ہے اور ارباب علم وتقویٰ سے اصطلاحی اہل حدیث کی شوخی نے اصابت حق کی نعمت اور عظیم سعادت سے ان کو محروم کر دیا ہے۔ ورنہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے لئے اس حقیقت واقعی کو سمجھنا کوئی مشکل اور بارگراں نہیں تھا۔

سید سمہودی مدنی متوفی ۹۱۱ھ حضور ﷺ کی حیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حیات الانبیاء کے دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ابدان کا غذا سے استغناء اور عالم میں قوت نفوذ کے باوجود ابدان انبیاءؑ کی حیات کا حال ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں ان کے ابدان کی حیات کا حال تھا۔ (وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۳۵۵)

جس صاحب بصیرت نے مسئلہ حیات پر قلم اٹھایا ہے، اس نے وہی لکھا ہے جو شیخ عبدالحق رحمہ اللہ اور مولانا مدنی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مولوی اسماعیل صاحب معتزلہ کا یہ گمراہ کن عقیدہ کہاں سے چرا کر لائے ہیں اور اہل سنت کے خلاف معتزلہ سے رشتہ ناطہ جوڑنا کہاں کی سنت ہے اور مولوی صاحب اور آپ کے فرقہ کو اس فرقہ کا یہ ساگھ کہاں پہنچا کر چھوڑے گا۔

برزخ میں شہداء کی حیات

قرآن شریف میں سورۃ بقرہ کی آیت میں شہداء کی حیات کی تصریح ہے اور اس میں یہ بھی اطلاع ہے کہ تم شہداء کی حیات کو نہیں سمجھتے۔ اس کی دریافت کرنے اور جاننے کے لئے تمہارے پاس وحی کی اطلاع کے بغیر کوئی فکر اور ذریعہ نہیں ہے۔ مگر کتاب وسنت کی زبان میں وہ زندگی ہے اور ضرور زندگی ہے اور ایسی زندگی کہ روحانی اور برزخی زندگی کے مقابل ہے۔ ورنہ عام اموات کو بھی کتاب وسنت میں زندہ کہا جاتا۔ اس لئے کہ عام مؤمنین کے اموات کو بھی برزخ

میں فی الجنہ روحانی زندگی حاصل ہے اور چونکہ قرآن شریف نے شہداء کی برتری اور فضیلت کو ظاہر کرتے ہوئے ان کو زندہ بتلایا ہے۔ اس لئے قرآن شریف کا منشاء یہ ہے کہ شہداء کو برزخ میں اس قسم کی زندگی دی گئی ہے۔ جو عام اموات کو نہیں ملتی۔ شہداء برزخ میں کھاتے پیتے ہیں۔ بے حد مسرور اور خوشحال ہوتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے شہادت کی دولت عنایت فرمائی اور اپنی نعمتوں سے نوازا اور ہر آن مزید انعامات کا سلسلہ قائم کر دیا ہے اور بے انتہاء خوش ہوتے ہیں کہ جو وعدے ان سے کئے گئے تھے۔ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور صرف اپنی اس حالت پر شاداں و فرحاں نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کا تصور کر کے بھی ان کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جن کو اپنے پیچھے جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول چھوڑ کر آئے ہیں کہ وہ بھی اگر ہماری طرح اللہ کی راہ میں مارے گئے تو ایسی ہی پر لطف اور بے خوف زندگی کے مزے لوٹیں گے۔ مولوی اسماعیل صاحب نے برزخ میں شہداء کی روحانی حیات کے اثبات کے لئے روح المعانی سے ناتمام استفادہ کی کوشش کی ہے۔ اس لئے میں سید آلوسی رحمہ اللہ کا پورا بیان نقل کرنا چاہتا ہوں۔

سید آلوسی رحمہ اللہ سورۃ بقرہ کی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''آیت نے شہداء کی موت کی بالکلیہ نفی نہیں کی کہ شہداء نے کسی وقت موت کا ذائقہ نہیں چکھا ہے۔ اگر قرآن شریف کی یہ مراد ہوتی کہ شہداء نے بالکلیہ موت کا ذائقہ نہیں چکھا ہے تو نہی کے بعد امواتا کی جگہ ماتوا فرما دیتے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جو مارے گئے ہیں یہ مت کہو کہ وہ نہیں مرے تھے بلکہ یہ فرمایا کہ مارے جانے کے بعد ان کو مردے نہ سمجھو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل ہو جانے کے بعد حیات بخشی ہے۔ شہداء کو مردہ کہنے سے آیت نے روکا ہے اور آیا برزخ میں شہداء کی حیات روحانی ہے یا جسمانی زندگی ہے۔ سلف میں کثیر التعداد حضرات نے کہا ہے کہ شہداء کی زندگی حقیقی اور جسمانی ہے۔ روح اور جسم دونوں زندہ ہیں اور عند ربھم یرزقون! اس قسم کی حیات کی دلیل ہے اور چونکہ قرآن شریف شہداء پر فضیلت اور امتیازی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے اور شہداء کی روحانی حیات میں غیر شہداء بھی ان کے شریک ہیں۔ اس میں شہداء کی خصوصی فضیلت اور امتیازی برتری نہیں ہے۔ اس لئے قرآن شریف کی مراد یہ ہے کہ شہداء جسمانی حیات میں زندہ ہیں اور یہی جسمانی زندگی ان کا مخصوص مقام اور امتیازی درجہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت قتادہ رحمہ اللہ، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت حسن رحمہ اللہ بصری صحابی اور تابعین اور مفسرین کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے سلف کو اس میں اختلاف ہے کہ برزخ میں شہداء اسی جسم میں زندہ ہیں جو دنیا میں تھا اور قتل نے اس کے نظام کو بگاڑ دیا ہے یا سبز رنگ پرندوں کی صورت میں شہداء کو زندگی دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے عاجز نہیں ہے کہ شہداء کے دنیاوی جسم میں حیات کو اتار دے۔ اگرچہ ہم اس کو زمین میں گلا سڑا دیکھتے ہیں اور حیات کے آثار اس میں ظاہر نہیں دیکھتے اور یہ ہماری کمزوری ہے کہ اصل حقیقت کچھ ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم اس کی پوری حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ حدیث میں ارشاد ہے کہ مومن کے لئے اس کی قبر انتہاء بصر کی حد تک کھول دی جاتی ہے اور اس کو کہا جاتا ہے کہ عروس کی نیند اس میں سو جاؤ۔ حدیث کے اس خبر کے باوجود بھی ہم میت کی قبر کو اس قدر کھلی ہوئی نہیں دیکھتے اور نہ میت کو اس میں عروس کی مانند سویا ہوا پاتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ خبر واقعی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ برزخ عالم غیب اور وہ عالم غیب کے احوال ہیں اور ہم عالم غیب کے احوال اور

واقعات کو نہیں جانتے ہیں۔ بشری اذہان اور قوی اس کے احوال کے ادراک سے قاصر اور دور ہیں اور بعض امامیہ کا دعویٰ ہے کہ برزخ میں دنیاوی اجسام میں شہداء کو زندگی ہوتی ہے۔

امامیہ کے اس دعوے پر سید آلوسی رحمہ اللہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: میں سمجھتا ہوں کہ شہداء اور غیر شہداء دونوں کو برزخ میں زندگی ہے اور ارواح اگرچہ جوہر قائم بانفسہا ہیں۔ لیکن اس امر سے کوئی مانع نہیں ہے کہ ارواح کو ایسے بدن برزخی کے ساتھ تعلق ہے کہ وہ اس کثیف بدن کے علاوہ اور مقابل ہے اور شہداء کی ارواح کو اس کے ساتھ ایسا تعلق اور ایسی وجہ پر تعلق ہے کہ شہداء کو غیر شہداء پر اس تعلق اور اس تعلق کی وجہ اور کیفیت میں امتیاز ہے اور یہ امتیاز یا اصل تعلق میں ہے یا بناء بر مشلک نہ بناء بر متواطی نفس حیات میں امتیاز ہے یا نفس متعلق بہ میں امتیاز ہے اور جس بات سے میرے دل کو تسلی اور اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ برزخی ابدان کو ان ابدان کے ساتھ پوری صوری مشابہت ہے۔ اگرچہ دونوں کے اجزاء متفاوت اور ان کے عناصر مختلف ہوں۔ اس لئے کہ دونوں جہانوں میں فرق ہے اور ہوسکتا ہے کہ حدیث میں سرعت حرکت کے اعتبار سے تشبیہ مراد ہو اور اگر چاہو تو یوں کہو کہ شہداء کی ارواح خود صورت میں متشکل ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ روح میں لطافت کی وجہ سے تجسد کی قوت ہے۔ جیسا کہ دحیہ کلبی رحمہ اللہ کی صورت میں روح الامین کا ظاہر ہونا حدیث میں ثابت ہے اور شہداء کا حیات اس قبیل سے ہے کہ ان کی ارواح خود تجسد اختیار کرتی ہیں اور یہ کہنا کہ برزخ میں شہداء کی دنیوی جسد زندہ ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات سے یہ بھی بعید نہیں ہے۔ اگر اس نے ایسا چاہا ہے تو کوئی مانع نہیں ہوسکتا۔ لیکن شہداء کی امتیازی حیات کو ثابت کرنے کے لئے اس دنیوی جسد کی زندگی چنداں ضروری نہیں ہے اور نہ صرف اس جسد کی حیات میں مزید فضل اور عظیم منت ہے۔ شہداء کی امتیازی حیات یہ ہے کہ ان کی ارواح کو تجسد ہے (ان کی ارواح نے جسد کی صورت کو اختیار کیا ہے) اور اس تجسد کو شہداء کی دنیاوی اجساد کے ساتھ اس قدر اتصال اور تعلق ضرور ہے۔ جس نے دنیاوی جسد کے اندر حیات کو پیدا کیا ہے (جس قدر کہ نائم کی زندگی ہے کہ اس کا جسم مردہ اور بے جان نہیں ہے)

سید آلوسی رحمہ اللہ کی بحث کا یہ خلاصہ ہے۔ سید رحمہ اللہ نے شہداء کی روحانی حیات بتلانے والے پر اعتراض کیا ہے اور شہداء کی روحانی حیات کے ادّعاء کو ناپسند فرمایا اور ''عند ربھم یرزقون'' اور شہداء کی خصوصی فضیلت اور برتری کے دلائل سے اس کو مسترد کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور مفسرین کی ایک جماعت کے اقوال سے اس کی تائید فرمائی اور ظاہر فرمایا ہے کہ ان کی ارواح نے تجسد کو اختیار کیا ہے اور ان کے ابدان دنیاوی میں حیات کو باقی اور قائم رکھا ہے۔ ان کے دنیاوی ابدان بہرحال زندہ ہیں اور نیز بتادیا ہے کہ ابدان شہداء کی حیات مستمر اور ہمیشہ ہے اور عام اموات مؤمنین کے اجساد کی طرح عارضی اور مخصوص اوقات میں ان کی حیات نہیں ہے کہ زائر کے واپسی اور رد سلام کے بعد ان کی حیات منقطع ہوجاتی ہے اور روح کا اس قسم کا اتصال ان سے قائم نہیں رہتا ہے کہ ان کو زندہ رکھے۔ بلکہ شہداء کی حیات نائم کی زندگی جیسی ہے۔ جب تک بھی سوتا رہے وہ زندہ ہے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب کا یہ کہنا کہ صاحب روح المعانی بھی شہداء کی روحانی حیات کے قائل ہیں۔ سید آلوسی رحمہ اللہ کے خلاف سراسر افتراء اور بہتان ہے۔

ہندوستان کا بیہقی قاضی صاحب تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں: ''بل احیاء و لٰکن لا تشعرون'' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھ سکتے۔ اس آیت میں اللہ کی طرف سے یہ تنبیہ ہے کہ شہداء کی حیات وحی سے معلوم ہوتی ہے یا اس

فراست سے جو وحی سے مکتسب ہے اور شہداء کے زندہ ہونے کا یہ معنی ہے کہ اللہ نے ان کی ارواح کو تجسد کی قوت عنایت کی ہے۔ وہ اجساد کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور زمین و آسمان، جنت سب جگہ کی سیر کرتی ہیں اور اپنے دوستوں کی مدد اور دشمنوں کو ہلاک کرتے ہیں اور ایسی زندگی کی وجہ سے ان کے دنیاوی اجساد اور اکفان کو زمین نہیں کھاتی ہے (اس لئے کہ ان کے دنیاوی اجساد میں روح کے خاص اتصال اور مستمر تعلق سے اس قدر زندگی ہے کہ زمین کے ضرر اور اثر سے ان کے اجسام اور اکفان گلنے اور سڑنے سے محفوظ ہیں)

مذکورہ احادیث پر نظر کر کے بعض علماء نے یہ فرمایا ہے کہ اس قسم کی حیات صرف شہداء کے ساتھ مخصوص ہے لیکن میرے نزدیک حق یہ ہے کہ اس قسم کی حیات صرف شہداء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آثار واحکام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی حیات بدرجہا ان کی حیات سے قوی اور بلند ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء کی حیات کا خارج میں اثر یہ ہے کہ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا ہر کسی کے لئے اور قیامت تک کے لئے ناجائز اور حرام ہے۔ بخلاف شہید کے کہ اس کی زوجہ سے نکاح کرنا جائز ہے اور صدیقین اس حیات میں شہداء سے اعلیٰ درجہ میں ہیں اور صالحین اولیاء اس حیات میں شہداء سے کم ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ملحق ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء میں ارشاد فرمایا ہے اور ان کی ترتیب ذکری رتبی ترتیب پر دلالت کرتی ہے۔

قاضی صاحب کی مراد یہ ہے کہ شہداء کی ارواح تجسد اختیار کر لیتی ہیں اور اس جسم کو دنیاوی صورت کے ساتھ پوری صوری مشابہت ہے اور اس جسم سے دنیا کا جسم اس قدر متاثر ہے کہ اس کی زندگی سے وہ زندہ ہے اور اس کی زندگی نے اس کو زمین کے اثر اور ضرر نے بچایا ہے اور انبیاء کی حیات شہداء کی حیات سے بدرجہا بلند اور اونچی ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حیات سے برابر اس وقت تک مستمر چلی آتی ہے کہ خارج میں اس کی قوت اور استمرار کا یہ اثر ہے کہ اس کے بعض دنیاوی احکام باقی اور قائم ہیں۔ ان میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا اس لئے حرام ہے کہ آپ کی حیات قائم ہے اور اس کے استمرار میں انقطاع نہیں آیا ہے۔ ورنہ ازالہ استمرار حیات کے بعد حرمت نکاح کا حکم قائم اور باقی نہ رہتا اور ازواج مطہرات حضور کے نکاح میں نہ رہتیں اور شہداء کے ابدان اگرچہ زندہ ہیں اور زمین کے اثر سے محفوظ ہیں۔ مگر کچھ وقفہ کے لئے ان کے قتل نے ان کی حیات کو زائل کر دیا تھا۔ اس لئے ان کی ازواج ان کے نکاح میں نہیں ہیں اور حضور ﷺ کے ازواج مطہرات آپ کے نکاح میں ہیں۔ اس لئے کہ استمرار حیات میں نکاح قائم ہے "والمحصنت من النساء" اور حرام ہوئیں تم پر خاوند والی عورتیں۔

حیات ابدان شہداء کے واقعات

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب احد کا جہاد سامنے آیا تو میرے والد نے مجھے فرمایا کہ شاید صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے پہلے میں شہید ہو جاؤں گا۔ حضور ﷺ کے سوا آپ سے زیادہ پیارا مجھے کوئی دوسرا نہیں ہے۔ دیکھو میرا قرضہ ادا کرنا اور اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ جہاد میں سب سے پہلے میرے والد مارے گئے اور میرے والد صاحب کے ساتھ قبر میں ایک دوسرے صحابی بھی دفنائے گئے۔ مگر میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ میرے والد کے ساتھ قبر میں کوئی دوسرا بھی ہو۔ میں نے چھ ماہ کے بعد اپنے والد ماجد کو قبر سے نکالا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی ان کو دفن کیا تھا۔ صرف ان کے کان پر ذرا سا اثر تھا۔ (بخاری کتاب الجنائز اول ص ۱۸۰)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کے ساتھ دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ آپ کے دوست اور بہنوئی عمرو بن الجموح دفنائے گئے تھے۔ ہشام بن عروہ عن ابیہ فرماتے ہیں کہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارک کی دیوار گر گئی اور جب اس کو اٹھانے لگے تو ایک قبر میں سے قدم ظاہر ہوا۔ لوگ گھبرا گئے اور خیال کیا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک قدم ہے۔ حضرت عروہ جانتے تھے۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم نہیں ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قدم ہے۔ (بخاری کتاب الجنائز ج اوّل ص۱۸۶)

عبدالرحمن بن صعصعہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن الجموح اور عبداللہ بن عمرو انصاری کی قبریں رو کے متصل واقع تھیں۔ اتفاق ہوا کہ سیل آئی اور دونوں کی قبریں کھود ڈالیں۔ جب دوسری جگہ ان کی قبریں کھودی گئیں تو ان کے ابدان میں ذرا بھی فرق نہیں ہوا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کل دفنائے گئے تھے اور یہ دونوں حضرات صحابہ احد کے دن شہید ہو گئے اور اس دن سے آج تک ۴۶ سال کی مدت گزر چکی ہے اور ان میں سے ایک صاحب نے اپنے زخم پر ہاتھ رکھا تھا اور جب اس کا ہاتھ زخم سے ہٹایا گیا اور چھوڑ دیا گیا تو پہلے مقام پر پڑ جاتا تھا۔ (مؤطا امام مالک کتاب الجہاد ج اوّل ص ۳۱۳)

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اپنے والد کو چھ ماہ کے بعد قبر سے نکالا اور ۴۶ سال کے بعد قبر سے نکالنے کا یہ دوسرا واقعہ ہے۔ بیہقی دلائل النبوت میں اور سید سمہودی روایت کرتے ہیں کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب نہر کظامہ جاری کرنے کا ارادہ کیا تو مدینہ منورہ میں آپ نے اعلان کر دیا کہ احد میں جو لوگ شہید ہو گئے ہیں ان کے وارث سب یہاں آئیں تو لوگ چلے گئے۔ شہداء کو دیکھا کہ وہ تروتازہ پڑے ہوئے ہیں اور ان کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ اتفاقاً ایک شہید کے پاؤں پر پھاوڑا پڑ گیا تو اس سے خون کا ایک فوارہ جوش مارنے لگا اور جب مٹی کھودی گئی تو تمام جگہ مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ (وفاء الوفاء ج ۲ ص ۹۳۹)

یہ ہیں شہداء کے ابدان کہ صرف محفوظ نہیں ہیں بلکہ ان میں زندگی کے آثار دیکھے گئے ہیں۔ ۴۶ سال کے بعد جسم کا تروتازہ ہونا اور وہ بھی قبر میں اور اپنے زخم پر اپنے اختیار سے سابق کی طرح ہاتھ رکھنا، بالوں کا بڑھ جانا اور پھاوڑا لگنے پر ان کے جسم سے خون کا نکلنا اور ان کی راحت اور مسرت کے لئے خوشبو کا ان کے پاس۔ یہ تمام بدن کی علامات اور آثار زندگی ہیں۔ جس قدر ان کے مناسب اور برزخ میں ان کے ابدان کے مناسب اللہ کے علم وحکمت میں زندگی ہے۔ ان کو عنایت کی گئی ہے۔

محدثین اور اہل علم نے شہداء کے مرزوق ہونے سے ان کی جسمانی حیات پر استدلال کیا ہے۔ اس استدلال پر مولوی اسماعیل کو دو شبہ ہیں:

پہلا شبہ یہ ہے کہ شہداء کا مرزوق ہونا جسمانی حیات کی دلیل نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ رزق عنداللہ ہے اور رزق عنداللہ روحانی ہے اور روحانی زندگی ہے۔

الجواب: برایں عقل ودانش بباید گریست۔ آیت کا مقصد شہداء کا مرزوق ہونا بتلاتا ہے اور عنداللہ کا مفاد صرف اس قدر ہے کہ ان کا مرزوق ہونا تم پر ظاہر نہیں ہے۔ تمہارے ادراک وشعور سے باہر ہے۔ مگر ان کو حق تعالیٰ رزق عنایت کرتا ہے۔ جیسا کہ دنیا کی زندگی میں جسم کی صحت اور بقاء حیات کے لئے رزق کی ضرورت تھی۔ اسی طرح برزخ میں بھی شہداء کو ان کے ابدان کے بقاء اور حیات کے لیے رزق دیا جاتا ہے اگرچہ وہ دنیا کی رزق کی طرح

نہیں ہے اور آیت میں رزق عند اللہ سے روحانی رزق اور روح کے لئے رزق سمجھنا نادانی اور بڑی غلطی ہے۔ حضرت مریم کے پاس رزق دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام نے پوچھا تھا یہ آپ کے لئے کہاں سے آتا ہے۔ جواب میں فرمایا "ھو من عند اللہ" اللہ کے پاس سے آتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ رزق بھی مادی تھا اور دنیا میں دنیاوی بدن کے لئے تھا۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ ارشاد ہے "فابتغوا عند اللہ الرزق" اللہ کے یہاں رزق ڈھونڈو دنیا میں اور دنیاوی بدن کے لئے بھی جو رزق تلاش کیا جاتا ہے وہ بھی اللہ کے پاس سے ہے۔

دوسرا شبہ: مولوی اسماعیل صاحب کہتے ہیں کہ رزق سے شہداء کی زندگی پر استدلال کرنا بے معنیٰ اور غلط ہے۔ اس لئے کہ رزق انبیاء اور شہداء کے علاوہ برزخ میں دوسرے مرنے والوں کو بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ آیت میں مذکور ہے "والذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا لیرزقنھم اللہ رزقاً حسناً" (الحج: ۵۸) ترجمہ: اور جو لوگ گھر چھوڑ آئے اللہ کی راہ میں پھر مارے گئے یا مرگئے البتہ ان کو دے گا اللہ روزی خاصی۔

جب طبعی موت مرنے والوں کو بھی رزق ملتا ہے تو شہداء کو رزق ملنے سے ان کے ابدان کی زندگی پر استدلال نہ رہا۔

الجواب: مولوی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ طبعی موت سے مرنے والوں کو بھی شہداء کی طرح رزق ملتا ہے اور سورت حج کی جس آیت سے تصدیق چاہا ہے۔ اس میں مہاجر فی سبیل اللہ کے لئے رزق کا وعدہ مذکور ہے۔ جن حضرات نے اللہ کی راہ میں دین کی نصرت اور دین کے دشمنوں کی مقاومت کے لئے اپنا گھر بار، اقارب احباب کو چھوڑا ہے۔ ایسے حضرات جن کے یہ مقاصد تھے خواہ وہ جہاد میں مارے جائیں یا اثنا راہ میں اور جائے قیام میں فوت ہو جائیں، شہداء کے حکم میں ہیں اور شہداء کی طرح اللہ کے پاس سے رزق میں شہداء کے برابر ہیں۔ قرآن شریف میں مذکور ہے "ولئن قتلتم فی سبیل اللہ او متم لمغفرۃ من اللہ ورحمۃ خیر مما یجمعون" (آل عمران: ۱۵۷) ترجمہ: (اگر تم مارے گئے اللہ کی راہ میں یا اللہ کی راہ میں مرگئے تو اللہ کی بخشش اور اللہ کی مہربانی بہتر ہے اس چیز سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

آیت نے شہید فی سبیل اللہ اور متوفی فی سبیل اللہ کے لئے ایک ہی قسم کا وعدہ بیان فرمایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فی سبیل اللہ مقتول اور فی سبیل اللہ متوفی دونوں کے لئے جزاء اور عطا اور بخشش کا ایک حکم اور ایک ہی فیصلہ ہے۔ اس میں کچھ شک اور تامل نہیں کہ شہید فی سبیل اللہ کے ساتھ اس جیسے رزق میں متوفی فی سبیل اللہ بھی شریک کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تو بحث نہیں ہے۔ بحث یہ ہے کہ عام اموات متوفین غیر مقتول فی سبیل اللہ اور غیر متوفی فی سبیل اللہ کے مقابلہ پر شہدا کے ابدان کو رزق ملنا اور ان کو رزق دیا جانا ان کے ابدان کی حیات پر دلیل ہے۔ مولوی صاحب کو اہل حدیث کہلانے کا شوق تو ہے۔ مگر آپ کی نگاہ ان احادیث پر نہیں پڑتی جن میں متوفی فی سبیل اللہ کو مقتول فی سبیل اللہ کے حکم میں اور اللہ کے وعدہ میں برابر ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔

ابو مالک اشعری کی حدیث میں مذکور ہے جو اللہ کی راہ میں نکلا پس فوت ہوا یا مارا گیا یا اس کے اسپ یا شتر نے اس کی گردن کو توڑ دیا یا اور کوئی آفت اس پر پڑ گئی تو وہ شہید ہے اور اس کے لئے جنت ہے۔ (بیہقی ج ۹ ص ۱۶۶)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: لوگو ایسا کہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو اللہ کی راہ میں مارا گیا یا فوت ہوا تو وہ جنت میں ہے۔ (بیہقی ج ۹ ص ۱۶۸)

سہل بن حنیف عن ابیہ عن جدہ کی حدیث میں ہے جس نے سچے دل سے شہادت کو چاہا تھا تو اس کو اللہ تعالیٰ شہداء کے منازل میں پہنچا دیں گے اگر چہ وہ اپنے فراش پر فوت ہو جائے۔ (بیہقی سنن کبریٰ ج ۹ ص ۱۷۰)

حضرت معاذ کی حدیث میں ہے جس نے اخلاص اور سچائی کے ساتھ شہادت کا سوال کیا پھر وہ فوت ہوا یا مارا گیا تو اس کے لئے شہید کا درجہ ہے اور جو فی سبیل اللہ نکل گیا تو اس پر شہداء کی مہر لگتی ہے۔ (سنن کبریٰ بیہقی ج ۹ ص ۱۷۰)

فضالہ بن عبید نے قتیل فی سبیل اللہ کے جنازہ پر لوگوں کو زیادہ مائل دیکھا اور متوفی فی سبیل اللہ کے جنازہ پر لوگ کم رغبت کرتے تھے تو آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا واللہ، میں پرواہ نہیں کرتا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی قبر سے اٹھایا جاؤں۔ لوگو اسنو! اللہ کی کتاب کو سنو ”و الذین ھاجروا فی سبیل اللہ ثم قتلوا او ماتوا“ (الحج: ۵۸، حافظ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۳۲)

ان مذکورہ احادیث نے قرآن شریف کی مذکورہ آیت کی یہ تفسیر کر دی ہے کہ قتیل فی سبیل اللہ اور مہاجر متوفی فی سبیل اللہ دونوں کے لئے اللہ کے یہاں ایک ہی حکم اور ایک ہی وعدہ اور دونوں کا مقام اور درجہ ایک ہے۔ اس لئے متوفی فی سبیل اللہ کو بھی شہید کی طرح رزق دیا جاتا ہے اور شہداء کا مرزوق ہونا ان کے ابدان کی حیات کی دلیل ہے۔ جیسا کہ مذکورہ شہداء کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے۔

انبیاء کی حیات دنیا کی حیات کی طرح جسمانی ہے

جب یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات جسمانی اور دنیاوی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح دنیا کی حیات میں روح کو اپنے جسم کے ساتھ ایسا اتصال ہوتا ہے کہ اپنے جسم میں تصرف و تدبیر کرتی ہے اور اس سے زندگی کے افعال و آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح برزخ کے اندر عالم غیب میں انبیاء علیہم السلام کے مقدس ارواح کو ان کے پاکیزہ اجسام کے ساتھ تدبیر و تصرف کا اتصال ہے اور زندوں کی طرح ان سے عالم غیب میں افعال و آثار کا ظہور ہوتا ہے اور دنیا کی زندگی میں جو ان کے جسمانی احکام تھے جیسا کہ دنیا میں زندہ آدمی کا اپنے املاک پر ملک قائم ہوتا ہے اور دنیا میں زندہ آدمی کی بیوی سے نکاح کرنا ناجائز ہے اور دنیا میں زندہ آدمی کے املاک میں کسی وارث کو میراث کا حق نہیں پہنچتا۔ اگر چہ انبیاء علیہم السلام عالم غیب میں ہیں۔ مگر دنیا میں ان کے یہ جسمانی احکام باقی اور قائم ہیں۔ انبیاء کی دنیاوی زندگی کے یہ معنی نہیں کہ وہ دنیا کے لوگوں میں آتے رہتے، وقت گزارتے ہیں اور دنیا والوں کی خوشی اور غم، فتح و شکست میں شریک اور دلچسپی لیتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی جسمانی زندگی پر سلف نے مفید اور پر معنی رسائل اور مضامین لکھے ہیں جن میں سے خصوصیت کے ساتھ بیہقی متوفی ۴۵۸ھ کا رسالہ حیات الانبیاء اور عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی رحمہ اللہ کا رسالہ انباء الاذکیاء اور شیخ تقی الدین سبکی کا رسالہ شفاء الاسقام اور حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کا رسالہ آب حیات اہل علم کے طبقہ میں زیادہ متداول اور معروف و مقبول ہیں اور میں انہیں حضرات محدثین کے فیوض سے استفادہ کروں گا اور اپنے الفاظ میں انہیں حضرات کا علم و نظر بیان کروں گا اور مولوی اسماعیل صاحب نے جو ان حضرات کی روایات پر اعتراض کیا ہے۔ اس کا جواب لکھوں گا۔ واللہ المستعان و علیہ التکلان!

حافظ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور تمام انبیاء علیہم السلام کی زندگی ہم کو قطعی معلوم ہے اور اس پر دلائل قائم ہیں اور متواتر اخبار سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ (الحاوی ج ۲ ص ۱۴۷)

مراد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی زندگی ان کی قبروں میں جسمانی ہے ورنہ روحانی زندگی کے لئے ان کی قبروں میں زندگی کی تخصیص کی ضرورت نہیں ہے اور نیز ان کی قبروں میں ان کی روحانی زندگی انبیاء کی شان عظیم میں کچھ اضافہ بھی نہیں کرتی ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آپ کے شیخ احمد بن عمر متوفی ۶۳۳ھ نے فرمایا ہے موت عدم محض نہیں ہے بلکہ ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوجانے کا نام موت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شہداء قتل کئے جانے اور موت آنے کے بعد بھی اپنے رب کے پاس زندہ ہیں کھاتے ہیں خوش ہیں اور خوشخبری دیتے ہیں اور یہ دنیا میں زندوں کی صفت ہے اور جب شہداء کا یہ حال ہے تو انبیاء علیہم السلام کو ایسی زندگی کا شہداء سے اولیٰ اور زیادہ حق ہے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرطبی اور آپ کے شیخ، شہداء کے لئے دنیا کی زندگی جیسی زندگی تسلیم کرتے ہیں اور دنیاوی زندگی جیسی زندگی کا انبیاء علیہم السلام کو شہداء سے بدرجہا زیادہ حق ہے اور حافظ ابن قیم نے ان کا یہ کہنا رد نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ حافظ کو بھی ان کے ساتھ اتفاق ہے۔

اور اس کے باوجود حضور علیہ السلام سے صحیح ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجساد کو زمین نہیں کھاتی ہے اور نیز صحیح ثابت ہے کہ معراج کی رات بیت المقدس میں اور آسمانوں میں حضور علیہ السلام انبیاء علیہم السلام سے بالعموم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بالخصوص ملے تھے اور نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مجھ پر سلام پڑھے گا تو میں اس کا جواب دوں گا۔ اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹا چکا ہے۔ اسی طرح دوسری احادیث جن کے مجموعہ سے یقین حاصل ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی موت کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ ہم سے غائب کردیئے گئے ہیں۔ ہم ان کو نہیں سمجھتے اگرچہ وہ زندہ موجود ہیں۔ جیسا کہ ملائکہ زندہ موجود ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے اور جب یہ ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں تو پھر جب پھونکا جانے صور میں ''فصعق من فی السمٰوات و من فی الارض الا من شاءاللہ'' (زمر:۶۸) انبیاء کا صعق بیہوشی ہے اور غیر انبیاء کا صعق موت ہے۔ نفخہ اولیٰ میں جو مرچکے تھے نفخہ ثانیہ میں وہ زندہ ہوجائیں گے۔ اور نفخہ اول میں جو بیہوش ہوگئے تھے وہ نفخہ ثانیہ کے بعد ہوش میں آجائیں گے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے مجھے بیہوشی سے افاقہ ہوگا۔ (کتاب الروح ص ۵۴، الحاوی ج ۲ ص ۱۴۹)

آیت مذکور کی تفسیر سید آلوسی رحمہ اللہ نے اساس سے یہ نقل کیا ہے کہ صعق غشی اور موت دونوں کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے ''صعق الرجل اذا غشی علیہ و صعق الرجل اذا مات'' اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''نفخۃ الصعق'' وہ ہے جس سے زمین اور آسمانوں میں زندہ نفوس مرجائیں گے۔ مگر جن کو اللہ چاہے اور دوسری بار نفخہ میں سب مرے ہوئے زندہ ہوجائیں گے اور قیامت کے احوال کو حیرت زدہ ہوکر تکتے ہوں گے اور مسند امام احمد میں عبداللہ بن عمرو کی روایت سے یہ حدیث مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیج دے گا اور آپ دجال کو ہلاک کردیں گے۔ پھر حق تعالیٰ شام کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلائے گا اور جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان ہے وہ اس ہوا سے فوت ہوجائے گا اور ایسے شریر لوگ رہ جائیں گے کہ طیور کی طرح ان میں توہم، نفور اور اضطراب ہوگا۔ فسق و فجور کی طرف مائل اور فساد پر آمادہ ہوں گے۔ ان کی رائے بری ہوگی، ان میں وقار نہیں ہوگا، ان کی عقل ناقص ہوگی۔ علم اور حلم سے عاری ہوں گے۔ قلت رحم۔ اہلاک و اتلاف، غضب اور وحشت ان کی

زندگی ہوگی۔ نہ معروف کو معروف جانتے ہوں گے اور نہ منکر کو منکر، شیطان کے اکسانے اور ترغیب دینے پر بتوں کو پوجیں گے، ان کا رزق وسیع ہوگا، خوش وقت اور خوش حال ہوں گے۔ ایسے وقت اور ایسے حال میں صور پھونکا جائے گا اور جس کے کان میں صور کی آواز پڑے گی وہ مرے گا۔ حتیٰ کہ کوئی باقی نہیں رہے گا۔ سب مر جائیں گے۔ پھر حق تعالیٰ شبنم کی طرح بارش برسائے گا جس سے اجسام اگ آئیں گے۔ پھر دوسری بار صور میں پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پھر کہا جائے گا لوگو! آؤ اپنے رب کی طرف آؤ۔ (مسند احمد حدیث نمبر ۶۵۵۵)

اس حدیث نے بتلا دیا ہے کہ نفخہ صعقہ سے لوگ مریں گے اور نفخہ ثانیہ سے لوگ زندہ ہوں گے اور بخاری کتاب الانبیاء میں حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث مذکور ہے۔ حضور فرماتے ہیں مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت مت دینا کیونکہ (نفخہ صور) کے بعد سب لوگ مر جائیں گے اور سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا "فاکون اوّل من یفیق" تو یکا یک میں کیا دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عرش کا ایک کونہ پکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آیا وہ ان لوگوں میں ہیں جو بے ہوش ہوئے مگر ان کو مجھ سے پہلے ہوش آئے گا یا ان لوگوں میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے بے ہوشی سے مستثنیٰ کر دیا۔ (بخاری باب وفات موسیٰ ص ۴۸۳ و باب ما یذکر فی الاشخاص ص ۳۲۵)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ ہے یا ان کو پہلی بے ہوشی کا بدلہ دیا گیا اور ابراہیم بن سعد کی روایت ہے "فان الناس یصعقون یوم القیامۃ فاصعق معھم فاکون اوّل من یفیق" اور عبداللہ بن الفضل کی روایت میں یہ ہے "فاکون من اوّل من بعث" اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے شعبی کی روایت میں یہ ہے "انی اوّل من یرفع راسہ بعد النفخۃ الاخیرۃ" ان روایات سے صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کی حدیث میں جو افاقہ مذکور ہے۔ وہ نفخہ ثانیہ کے بعد ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۴۴۵)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ابن حزم نے گمان کیا ہے کہ قیامت کے دن نفخات کی تعداد چار ہے لیکن یہ واضح نہیں ہے بلکہ نفخات دو ہیں۔ ایک نفخہ صعق ہے جس سے ہر ایک زندہ مر جائے گا اور جو مرنے والا نہیں ہے اس کو بے ہوشی ہو جائے گی اور نفخہ ثانیہ نفخہ بعث ہے۔ جس سے وہ لوگ زندہ ہو جائیں گے جو نفخہ اوّل میں مر چکے تھے اور جو بے ہوش ہو چکے تھے ان کو افاقہ ہوگا۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۴۴۶ باب وفات موسیٰ علیہ السلام)

غرض اس تفصیل کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غشی سے افاقہ ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یا بیہوشی نہیں آئی یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے نفخہ ثانیہ کے بعد ہوش میں آ گئے تھے اور بے ہوشی زندوں کو ہوتی ہے۔ جیسے صعقۃ الطور میں موت نہیں تھی افاقہ فرمایا گیا ہے۔ نفخہ اولیٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے۔ اس لئے ان کو بے ہوشی ہوگئی اور نفخہ ثانیہ کے بعد افاقہ ہوا اور دوسرے لوگ جو نفخہ اولیٰ کے وقت زندہ تھے وہ مر گئے تھے اور نفخہ ثانیہ کے بعد وہ موت سے زندہ کئے گئے تو قرطبی اور اس کے شیخ اور حافظ ابن قیم کی غرض یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ آرام گاہ نبوت میں نفخہ اولیٰ کے وقت آپ زندہ ہیں ور نیز صعق ایک لفظ ہے۔ مگر جب اس کی نسبت عام لوگوں کی طرف کی گئی تو ان کی موت مراد ہے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کی گئی تو اس کے معنی بے ہوشی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے صعق اور غیر انبیاء کے صعق میں فرق ہے۔ اسی طرح انبیاء اور غیر انبیاء کی موت میں بھی فرق ہونا ممکن ہے کہ غیر انبیاء کی موت نے ان کی حیات کا ازالہ کر دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی موت ساتر حیات ضرور ہے۔ مگر

حیات کا ازالہ نہیں کیا ہے بلکہ زیر پردہ ان کی حیات قائم ہے۔ محدثین کے فکر ونظر میں انبیاء کی زندگی کیسی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: انبیاء علیہم السلام الامن شاء اللہ استثناء میں داخل ہیں۔ جیسے کہ موسیٰ اس میں داخل اور نفحہ اولیٰ میں صعقۃ الموت صرف زندوں کے لئے ہے اور جن کو پہلے موت آچکی ہے۔ وہ مستثنیٰ ہیں اور انبیاء علیہم السلام اگرچہ نفحہ اولیٰ کے وقت دوسرے زندوں کی طرح زندہ ہیں۔ لیکن اہل دنیا کے عام دنیاوی زندگی کے مقابلہ پر انبیاء علیہم السلام اموات کی صورت میں ہیں۔ اگرچہ حقیقتاً نفس الامر کے اعتبار سے اموات کی صورت میں بھی نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۴۴۵ باب وفات موسیٰ)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی طرح قرطبی رحمہ اللہ نے بھی ایسا کہا ہے۔ اگر نفحہ اولیٰ کے وقت اور اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام نفس الامر کے اعتبار سے حقیقتاً اور اجساد میں زندہ ہیں۔ اگرچہ اہل دنیا کے عام واقعات پر شامل زندگی کے مقابلہ پر انبیاء علیہم السلام کو اموات کی صورت میں محدثین ظاہر کرتے ہیں تو اس میں کچھ استبعاد نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی موت اہل دنیا کے واقعات دنیا پر مشتمل زندگی کے مقابلہ پر موت کی صورت میں تھی۔ لیکن نفس الامر کے اعتبار سے اس وقت بھی ان کی حیات قائم تھی۔ اگرچہ وہ ظاہر نہ تھی۔ مگر دنیا میں زندگی کی طرح اس کے دنیاوی اور جسمانی احکام اس وقت بھی مثلاً املاک پر قیام ملک اور ازواج مطہرات سے قیام نکاح کے احکام باقی اور قائم تھے۔

حافظ ابن حجر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ حضور ﷺ نے انبیاء علیہم السلام میں کسی نبی علیہ السلام کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور کسی کو حج کرتے ہوئے اور حج و نماز وغیرہ عبادات کا سلسلہ موت کے بعد کیسے باقی رہ سکتا ہے۔ موت کے بعد تکلیف باقی نہیں رہتی۔ لکھتے ہیں: جب انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں تو کوئی مستبعد نہیں ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے اور دنیا کا دار تکلیف ہونا باقی ہے۔ انبیاء علیہم السلام نماز، حج اور دیگر قربات کو حسب استطاعت کرتے رہیں گے۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۳۷۶ باب قولہ تعالیٰ واذکر فی الکتاب مریم)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی طرح بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو حقیقتاً اور بیداری میں دیکھا ہے اور حدیث اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں۔ اپنی قبر میں نماز پڑھتے ہیں جیسا کہ دنیا کی زندگی میں نماز پڑھتے تھے اور یہ ممکن ہے۔ اس سے مانع کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰ آج تک دنیا میں ہے اور دنیا دار تعبد عبادت کا گھر ہے (جب تک انبیاء علیہم السلام دار الجزاء میں نہیں پہنچے ہیں تو ان کی زندگی دنیا کی زندگی کی سی ہے اور دنیا میں ہونے کی حالت کی طرح عالم برزخ میں بھی دار تعبد کی زندگی قربات وعبادات کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا تھا کہ دنیا کا دار التکلیف ہونا مسلم ہے اور جب تک یہ دنیا باقی ہے اس دنیا میں دار التکلیف میں ہونے کی طرح انبیاء علیہم السلام نماز اور حج اور دیگر قربات کو حسب استطاعت کرتے رہیں گے۔ عالم برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی متعبدانہ زندگی قیام قیامت تک دنیا کی تکلیفی زندگی جیسی ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی تکلیفی نہ ہو اور عالم برزخ عالم تکلیف نہیں ہے)

قرطبی رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت کی مزید شرح کرتے ہوئے علامۃ الحدیث مناوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا تکلیفی حکم کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اکرام وتشریف کا یہ حکم ہے کہ برزخ میں قبر میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نماز پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں تھے تو ان کی محبت اللہ سے تھی اور اللہ

کی عبادت نماز وغیرہ سے محبت تھی اور اسی حالت میں انہوں نے اپنے اختیار سے جیسا کہ آگے آئے گا دنیا کو چھوڑا ہے تو حق تعالیٰ نے عالم برزخ میں بھی ان کی دنیاوی زندگی کے اس شرف اور اکرام کو باقی رکھا اور ملائکہ کی طرح ان کی عبادت تکلیفی نہیں ہے بلکہ الہامی ہے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کے لئے مراتع اور مسارح ہیں اس میں جہاں چاہتے ہیں، پھرتے اور پہنچتے ہیں۔ پھر واپس لوٹتے ہیں۔ اس لئے حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی رات قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور آسمان پر بھی دیکھا۔ (فیض القدیر ج ۵ ص ۵۱۹)

امام بیہقی رحمہ اللہ کتاب الاعتقاد میں لکھتے ہیں: انبیاء علیہم السلام کی ارواح قبض کئے جانے کے بعد انبیاء علیہم السلام کی طرف واپس لوٹائی گئی ہیں اس لئے اپنے رب کے پاس انبیاء زندہ ہیں جیسے شہداء۔ (وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۳۵۵)

عرض یہ ہے کہ جس طرح شہداء کو ان کے قتل کئے جانے کے بعد زندگی بخشی گئی ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے اولیٰ اور اعلیٰ حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کو ان کی ارواح عالم برزخ میں واپس کر دی گئی ہیں اور ان کی زندگی اس طرح کی ہے کہ ان کی ارواح ان کے ابدان کے ساتھ تدبیر و تصرف کا تعلق رکھتی ہیں اور قبض ارواح ازالہ حیات کو مستلزم نہیں ہے۔ بلکہ بعض قبض ارواح کے باوجود بھی حیات قائم رہتی ہے۔ اگر چہ افعال حیات سے وہ معطل ہیں۔ جیسا نائم کہ نیند کی حالت میں اس کی روح قبض کر لی گئی ہے۔ مگر اس کی حیات قائم ہے۔ کوئی بھی نہیں کہتا کہ نائم مردہ ہے۔ قرآن شریف میں مصرح مذکور ہے کہ نائم کی روح کو بھی اللہ تعالیٰ کھینچتا ہے۔ مگر ابھی اس کی حیات کے ایام باقی ہیں تو اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نوم کے وقت بھی نائم کی روح نکالی جاتی ہے۔ مگر اس جسم کے ساتھ ایک قسم کا ایسا تعلق باقی رہتا ہے۔ جس سے جسم کی حیات قائم رہتی ہے۔

اسی طرح انبیاء کی ارواح قبض کر لی جاتی ہیں اور موت کی صورت ان کو عارض ہوتی ہے۔ لیکن عام اموات کی طرح اس وقت بھی وہ مردہ نہیں ہے۔ بلکہ ان میں اس وقت بھی اس درجہ حیات قائم ہے۔ جس نے ان کی حیات جسمانی کے بعض احکام دنیاوی کو جیسا کہ مذکور ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی مذکور ہوں گے قائم اور باقی رکھا ہے۔ موت کے وقت بھی انبیاء کی حالت نائم کی سی ہوتی ہے۔ نائم کے لئے جس طرح اس کی روح کو اس کی طرف چھوڑنا مقدر ہے۔ اسی طرح انبیاء کو ان کی ارواح کا واپس لوٹانا اللہ کی تقدیر ہے۔ جس کو روح کا واپس لوٹانا اللہ کا فیصلہ ہے۔ اس کی موت اور اس سے اس کی روح کا نکالنا بھی حیات کا ازالہ نہیں کرتی ہے۔ بلکہ اس کی موت اس میں تعطل پیدا کرتی ہے اور افعال حیات سے روک دیتی ہے اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف یا ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف جانے اور پہنچنے کے قابل اور مناسب بنا دیتی ہے۔ جیسا کہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کتاب الروح میں کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی موت صرف اس قدر ہے کہ ہم سے غائب کر دیئے گئے ہیں۔ محدثین نے عالم برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی نماز اور حج اور دیگر قربات کی روایات کو روایت کیا ہے اور دنیا کی نماز اور حج کی حقیقت کی طرح انبیاء کی نماز اور حج کو تسلیم کرتے ہیں اور محدثین کو اعتراف ہے کہ اس دنیا کے باقی رہنے تک عالم تکلیف میں ہونے کی طرح عالم برزخ میں انبیاء نماز و حج کی عبادت کرتے ہیں اور نماز و حج کے محل تکلیف اجسام ہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ محدثین کا عقیدہ اور نظریہ یہ ہے کہ دنیا کی حیات کی طرح انبیاء علیہم السلام کے اجساد مقدسہ زندہ ہیں۔

سید آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امت کے صلحاء کے اقوال اور احادیث نبویہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسالت

مآب ﷺ اپنے جسد اور روح دونوں میں زندہ ہیں اور زمین وملکوت کے اقطار واطراف میں جہاں چاہتے ہیں سیر کرتے ہیں اور وفات سے پیشتر جس ہیئت پر دیکھے جاتے تھے آج بھی اسی ہیئت پر موجود ہیں۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ فرق آیا ہے تو صرف اس قدر کہ رسالت مآب ﷺ ہماری نگاہوں سے غائب کر دیئے گئے ہیں۔ جیسا کہ ملائکہ ہم سے پوشیدہ ہیں۔ اگر چہ زندہ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جس کا اکرام منظور ہوا اور جس پر احسان کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ اس حائل کو اٹھا دیتا ہے اور اس قدیم اور پاکیزہ صورت پر جمال جہاں آراء کی زیارت سے سرفراز فرماتا ہے۔ (روح المعانی تفسیر آیت خاتم النبیین)

عام اموات کی طرح حضور ﷺ کی موت نہیں ہے

زرقانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: عام اموات کو ہمیشہ کے لئے موت ہے اور رسالت مآب ﷺ کی موت مستمر نہیں ہے۔ حضور ﷺ کو موت عارض ہوئی ہے۔ مگر اس کے بعد برزخ میں آپ کو زندگی حاصل ہے اور اس زندگی میں اس موت کے بعد بھی آپ کے املاک پر اسی طرح ملک قائم ہے اور اسی قیام ملک اور اس زندگی کی بنیاد پر ازواج مطہرات کے لئے آپ کے املاک میں نفقہ لازم ہے اور سبکی رحمہ اللہ نے حضور ﷺ کی حیات (غیر منفک) کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اپنے املاک پر حضور کا ملک قائم ہے اور اس تعلیل کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے احکام میں بھی حضور ﷺ کی زندگی ثابت ہوتی ہے اور حضور ﷺ کی اس قسم کی زندگی عالم برزخ میں شہداء کی زندگی سے زائد اور بالا زندگی ہے۔ (اس لئے کہ شہداء کی زندگی اگر چہ جسمانی زندگی ہے۔ مگر دنیا کے احکام میں وہ قائم اور باقی نہیں ہے) (زرقانی شرح مواہب ج ۵ ص ۲۳۳)

امام حدیث بیہقی رحمہ اللہ نے اس مضمون کے اظہار کے لئے ذیل کا عنوان باندھا ہے: "باب کان ماله بعد موته قائم علی نفسه وملکه" حضور ﷺ کے اموال پر موت کے بعد بھی حضور ﷺ کا ملک اور تصرف کا حق باقی ہے اور اس بحث میں بخاری اور مسلم میں مذکورہ جناب فاطمۃ الزہراء کا مطالبہ اور اس کے جواب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبان سے بیہقی رحمہ اللہ نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے وہ ازواج مطہرات کے نفقہ اور عامل کو حق الخدمت ادا کرنے کے بعد صدقہ ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۷ ص ۶۵)

حضور ﷺ کے اس ارشاد کی تہ میں نا قابل انکار حقیقت واقعی یہ ہے کہ آپ کو عروض موت نے آپ کی سابق حیات کو منقطع نہیں کیا تھا بلکہ وہ ظاہر اور در پردہ مستمر چلی جاتی ہے۔ ورنہ انقطاع حیات کے بعد جدید ملک کے قائم کئے بدوں اپنے املاک پر سابق ملک کے قیام کے کچھ معنی نہیں ہے اور اہل وعیال کے لزوم نفقہ کا موجب اختصاص منفعت اور ملک نکاح ہے اور انقطاع حیات کے ساتھ ساتھ ملک نکاح کا اٹھ جانا لازم ہے۔ اگر اس موت میں زندگی منقطع ہو چکی ہے اور ملک نکاح اٹھ چکا ہے تو عدت وفات کے بعد بھی ازواج مطہرات کے لئے حضور ﷺ کے املاک میں لزوم نفقہ کے التزام رکھنے کی وجہ نہیں ہے۔

زرقانی رحمہ اللہ، سبکی رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ کا یہ نظریہ کہ وفات کے بعد بھی اپنے املاک پر حضور رسالت مآب ﷺ کا ملک باقی ہے۔ اس بنیاد پر قائم ہے کہ حضور ﷺ کی موت نے آپ کی حیات کو زائل اور منقطع نہیں کیا ہے اور آپ کی زندگی موت کے وقت اور موت کے بعد بھی در پردہ قائم تھی اور قائم ہے اور اس نظریہ کی دلیل حضور ﷺ کا مذکورہ

ارشاد ہے اور نیز ان محدثین کے مذکورہ نظریہ کی کتاب وسنت میں فرائض کی حدود اور احکام کے بیان سے تائید ہوتی ہے۔ کتاب وسنت میں قرب وبعد کے اعتبار سے بناء برفرض وتعصیب اقارب کے لئے مال متروکہ میں لازم اور متعین حقوق رکھ دیئے گئے ہیں۔ کتاب وسنت میں ثلث تک وصیت درست ہوسکتی ہے اور حضور ﷺ کا اپنا ترکہ میراث میں اقارب سے روکنا اور مذکورہ ضروری مصارف کے علاوہ کل ترکہ صدقہ بنا کر چھوڑنا اس قدر مطلق اور عام تصرف اور اختیار ثابت کرتا ہے کہ بوقت ترکہ بھی جو موت کا وقت ہے۔ حضور ﷺ کو زندگی جیسا اختیار وتصرف کا حق اس لئے حاصل ہے کہ آپ کی موت میں آپ کی حیات کا ازالہ اور انقطاع نہیں ہوا ہے۔ ورنہ جس کی موت نے اس کی حیات کو بالکلیہ زائل اور منقطع کر دیا ہے۔ اس کے ترکہ پر کتاب وسنت نے اقارب کے لئے حقوق متعین کر دیئے ہیں اور ایسی حدود عائد کی ہیں۔ جن سے تجاوز کرنا کسی ادنیٰ مسلمان کے لئے بھی جائز اور قابل برداشت نہیں ہے۔ چہ جائے کہ رسالت مآب ﷺ کا بوقت موت بھی زندوں جیسا اپنے اموال کو جس قدر چاہا اور جس کے لئے چاہا اپنے اختیار سے چھوڑنا کتاب وسنت کے خلاف نعوذ باللہ من ذالک اقدام کرنے کا ارادہ فرمایا۔

انہیں حضرات محدثین کی طرح حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی موت میں بھی مثل حیات فرق ہے۔ ہاں فرق ذاتیت وعرضیت منظور نہیں۔ وجہ اس فرق کی وہی تفاوت حیات ہے۔ حیات نبوی بوجہ ذاتیت قابل زوال نہیں اور حیات مومنین بوجہ عرضیت قابل زوال ہے۔ اس لئے وقت موت حیات نبوی ﷺ زائل نہ ہوگی۔ ہاں مستور ہو جائے گی اور حیات مومنین ساری یا آدھی تہائی زائل ہو جائے گی۔ (آب حیات ص ۲۰۸)

اس سے آگے لکھتے ہیں: ہاں علاقہ حیات انبیاء علیہم السلام منقطع نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے ازواج نبوی ﷺ اور نیز اموال نبوی ﷺ بدستور آپ کے نکاح اور آپ کے ملک میں باقی ہیں اور اغیار کو اختیار نکاح ازواج اور ورثہ کو اختیار تقسیم اموال نہیں۔ بالجملہ موت انبیاء اور موت عوام میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ وہاں استتار حیات زیر پردہ موت ہے اور یہاں انقطاع حیات بوجہ عروض موت ہے اور شاید یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جناب باری نے حضرت سرور عالم ﷺ کو جدا خطاب کر کے ارشاد فرمایا ''انک میت'' اور سوا آپ کے اوروں کو بھی جدا ارشاد فرمایا ''انهم ميتون'' اور مثل جملہ لاحقہ ''ثم انكم يوم القيامة عند ربكم تختصمون'' سب کو شامل کر کے یوں ارشاد نہ فرمایا ''انکم میتون'' بالجملہ جیسے حیات نبوی ﷺ اور حیات مومنین امت میں فرق ہے۔ چنانچہ اس کے اثبات کے لئے تقریر دانی اور تحریر شافی کافی اوراق گزشتہ میں گزر چکی ہے۔ ایسی ہی موت نبوی ﷺ اور موت مومنین میں بھی فرق ہے اور بوجہ فرق بین الموتین وہی فرق بین الحیاتین ہے۔ (آب حیات ص ۲۲۰)

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی مراد ظاہر ہے کہ حیات نبوی ذاتی ہے۔ اس لئے بوقت موت بھی منقطع اور زائل نہیں ہوتی ہے اور تمام املاک پر بوقت موت بھی ملک قائم ہے اور ازواج مطہرات بوقت موت آپ کے نکاح میں ہیں۔ اس لئے لازماً ماننا پڑتا ہے اور ضرور ماننا چاہئے کہ آپ کی موت نے آپ کی حیات کو زائل اور منقطع نہیں کیا ہے اور اس کی وجہ کہ انبیاء علیہم السلام کی موت اور مومنین کی موت میں فرق یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں مومنین کی موت کو الگ اور حضور ﷺ کو خطاب میں منفرد کیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن شریف کی بلاغت اور معجزانہ اسلوب میں ایسے معانی مشار الیہ ہوتے ہیں۔ جو قرآن شریف کی نظم میں منصوص نہیں ہوتے۔ مگر اس کے اسلوب سے مفہوم ہوتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں دوسروں کی موت میں حضور ﷺ کو شامل نہ کرنا اور حضور ﷺ کو جداگانہ خطابات

فرمانا اور دوسروں کی موت کی جداگانہ خبر دینا ظاہر کرتا ہے کہ قرآن شریف کو اس اسلوب میں کچھ مزید معنی بیان کرنا مقصود ہے اور ہوسکتا ہے کہ آیت میں مزیت اور مزید معنی وہی ہے جو حضرت مولانا نے فرمایا ہے کہ موت نبوی میں حیات مستور ہو جاتی ہے اور دوسروں کی موت میں حیات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

قرآن شریف میں ایسی مثالیں مذکور ہیں کہ قرآن شریف اپنے بیان میں مشمولہ فرد یا افراد میں باہمی فرق وتغایر کو بتلانے اور ظاہر کرنے کے لئے اس بیان میں بعض فرد یا افراد کو بعض سابق مذکورہ سے الگ اور جداگانہ ذکر کرتا ہے۔

پہلی مثال: ''من کان عدو اللہ وملائکتہ ورسلہ وجبریل ومیکال'' (البقرۃ: ۹۸) میں جرائیل اور میکائیل ملائکۃ اللہ میں شامل تھے۔ مگر ذکر ملائکۃ اللہ کے بعد جرائیل اور میکائیل کو اس لئے ذکر کرنے میں الگ اور منفرد کیا گیا ہے کہ قرآن شریف فضیلت اور مزید شرف میں جرائیل اور میکائیل کو فرشتوں سے الگ کرتا ہے اور اس میں تغایر وصفی کو تغایر ذاتی کا مقام دے دیتا ہے۔

دوسری مثال: ''فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھؤلآء شھیدا'' (النساء: ۴۱) میں رسالت مآب ﷺ ''من کل امۃ بشھید'' میں شامل ہیں۔ مگر قرآن شریف حضور ﷺ کی شہادت اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شہادت میں اس فرق تغایر کو بتلانا چاہتا ہے کہ دوسرے انبیاء کی شہادت امت کے فساد عقائد اور قبائح اعمال پر ہوگی اور حضور ﷺ کی شہادت دوسرے انبیاء کے صدق اور راستی پر اس لئے حضور ﷺ کی شہادت کو الگ اور حضور ﷺ کو جداگانہ خطاب کیا گیا کہ دونوں شہادتوں میں فرق تھا۔

تیسری مثال: ''واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح وابراھیم وموسی وعیسی بن مریم واخذنا منھم میثاقا غلیظا'' (الاحزاب: ۷) میں منصوص حضرات انبیاء بھی من النبیین میں شامل تھے۔ مگر مزید فضل وشرف اور ارباب شرائع ہونے میں دوسرے انبیاء اور ان حضرات انبیاء میں فرق تھا۔ گویا کہ یہ حضرات دوسرے حضرات انبیاء سے الگ ہیں یا ان حضرات کا میثاق ان حضرات انبیاء کے میثاق سے الگ اور مغایر تھا۔ اس لئے ان حضرات انبیاء کو ان حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے بعد حضور ﷺ کو جداگانہ خطاب اور منفرد ذکر کیا ہے۔

اسی طرح مذکورہ آیت میں نفس موت کے اعتبار سے دوسروں کے ساتھ رسالت مآب ﷺ بھی شامل ہیں۔ مگر حضور ﷺ کو اس میں جداگانہ خطاب میں اور ذکر کرنے میں دوسروں سے الگ اور منفرد کیا گیا ہے۔ اس لئے قرآن شریف حضور ﷺ کی موت اور دوسروں کی موت میں فرق وتغایر کو بتلانا چاہتا ہے اور حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے حضور کی حیات ذاتی اور دوسرے مومنین کی عرضی ہونے پر بھی مدلل بحث فرمائی ہے۔ میں بخوف طوالت اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ صرف بہت مختصر اور اس قدر حصہ اس سے اس غرض کے لئے یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جس سے آپ یہ اندازہ کرسکیں کہ حضرت مولانا کے تمام دلائل اور وجوہات کا مآخذ کتاب وسنت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ حضرت مولانا کہتے ہیں بشہادت آیت کریمہ ''النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم'' حیات مومنین کے حق میں ایک صفت عرضی بمعنی بالعرض ہوگی۔ جس کا موصوف بالذات بحکم تقاریر گزشتہ نفس مقدس سرور انفس ﷺ ہوگا اور بایں لحاظ کہ صفات ذاتیہ قابل انفکاک نہیں ہوتیں اور صفات عرضیہ قابل زوال ہوتی ہیں۔ اس بات کا قائل ہونا پڑے گا کہ نفس مقدس نبوی ﷺ اور حیات میں نسبت ضرور یہ ذاتیہ ہے اور نفوس مومنین اور حیات میں نسبت

امکان ذاتی ہے۔ بالجملہ حیات نبوی ﷺ دائمی ہے۔ ممکن نہیں کہ آپ کی حیات زائل ہو جائے اور حیات مؤمنین عرضی ہے۔ زائل ہو سکتی ہے۔ (آب حیات ص ۱۷۳)

اس کے بعد حضرت مولانا، انبیاء علیہم کے انبیاء ہونے کی وجہ اور علت اور امتیوں کے امتی ہونے کی وجہ اور علت اور اس پر کہ امتیوں میں سے کوئی امتی نبی نہیں ہو جاتا ہے، بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس لئے کہ واسطہ فی العروض اور متوثر اور علت اور منشاء انتزاع ہونا واسطہ فی العروض اور متوثر اور علت اور منشاء انتزاع کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ ارادہ کے نیچے اصل میں افعال اختیار یہ داخل ہیں اور جو چیزیں بوسیلہ افعال اختیار یہ حاصل ہوتی ہیں جیسے درہم و دینار مثلاً ان کو کسبی اور اختیاری بوجہ مداخلت افعال اختیار یہ کہتے ہیں اور صفات ذاتیہ مرید و مختار نہ از قسم افعال ہیں، نہ افعال اختیار یہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ بلکہ ذات صفات مذکور بھی خداداد ہوتے ہیں۔

دیکھئے استماع و ابصار جو از قسم افعال ہیں اختیاری ہیں۔ مگر خود سمع و بصر اختیاری نہیں۔ عطاء خدائے واہب العطایا ہیں۔ ورنہ اندھے مادرزاد اور بہرے مادرزاد سمع و بصر حاصل کیا کرتے اور ظاہر ہے کہ علّیت و معلولیت و متوثریت و اثریت اور وساطت عروضی اور عارضیت اور منشائیت انتزاع لوازم مراتب مخلوقیہ سے ہیں اور لوازم مخلوقیہ مخلوقات کے اختیار میں نہیں ورنہ ہر کوئی اپنے حسب دلخواہ مراتب جلیلہ و جمیلہ حاصل کر لیا کرتا بالجملہ امور مذکورہ صفات ذاتیہ میں سے ہیں اور مثل ذات محض بقدرت الٰہی شخص معین ہوتی ہیں۔ موصوف اوصاف مذکورہ کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے جیسے آفتاب کو فاعل تنویر اور مصدر شعاع بنادیا اور زمین کو مثلاً قابل تنویر اور شعاع کو صادر اور آتش کو محرق اور مصدر حرارت اور چوب کو مثلاً قابل احتراق اور حرارت کو صادر بنایا۔ ایسے ہی انبیاء کو مصدر ارواح مؤمنین اور ارواح کو صادر بنادیا۔ الخ (آب حیات ص ۱۷۵)

حضرت مولانا کی مراد ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ حسب تفسیر سابق یہ شہادت دیتی ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی حیات ذاتی ہے اور مومنین کی حیات عرضی ہے۔ اس لئے حضور ﷺ کی حیات نا قابل زوال ہے اور مومنین کی حیات کا زوال ممکن ہے۔ درحقیقت حیات کا موصوف بالذات رسالت مآب ﷺ کا نفس مقدس ہے اور ارواح امت اس کے آثار ہیں۔ ارواح مومنین آپ کی روح پرفتوح سے پیدا ہوتے ہیں اور رسالت مآب ﷺ کا نفس مقدس واسطہ فی العروض یعنی اوّلاً بالذات درحقیقت عارض کا موصوف ہے اور منشاء انتزاع ارواح مؤمنین ہے اور حضور ﷺ کی یہ صفات مثل ذات اقدس کے اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں ہیں کہ کسی بہانہ گر اور حیلہ جو متوحد کو فاسد وہم ہو جائے۔ بلکہ یہ بخشش بہ انعام واہب العطایا خداوند تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ جیسا کہ آفتاب میں نور ذاتی ہے اور دوسروں میں مستعار ہے۔ آفتاب سے روشنی پھیلتی ہے اور ہمیشہ وہ روشن رہتا ہے پر دوسروں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ آتش کی حرارت ذاتی ہے۔ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ پر دوسروں کی گرمی سرد ہو جاتی ہے اور چونکہ خود بخود بغیر کسی خارجی اثر کے سرد ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ عرضی تھی۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے ارواح انبیاء کو ارواح مؤمنین کا مصدر بنادیا ہے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ اس مضمون کی مزید تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ آیت مذکورہ کی تفسیر سابق سے رسالت مآب ﷺ کی ابوۃ روحانی ثابت ہوگئی۔ اس لئے کہ درحقیقت ابوت وساطت ایجاد ہے۔ یعنی والد جسمانی سلسلہ ایجاد میں واسطہ وجود ولد ہوتا ہے۔ سو ایسی ہی ارواح انبیاء خصوصاً سرور انام علیہم واسطہ وجود ارواح امم ہیں۔

کیونکہ انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت سید الموجودات ﷺ حسب تحریر گزشتہ منشاء انتزاع ارواح مومنین امت ہوتے ہیں اور ارواح امت ان کے حق میں مجملہ انتزاعیات ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ والد جسمانی کو وجود ولد میں اتنا دخل نہیں جیسا منشاء انتزاع کو وجود انتزاعیات میں دخل ہوتا ہے۔ بالجملہ والد روحانی کو خود جناب خالق اکبر کے ساتھ ایک نوع کی مشابہت تامہ ہے۔ ممکنات کو حدوث میں کیا بقاء میں کیا وجود باری کی ضرورت اور اس کی طرف احتیاج ہے۔ ایسے ہی انتزاعیات وغیرہ کو منشاء انتزاع وغیرہ کے حدوث بقاء میں ضرورت ہے۔ اس جگہ سے اہل فہم کو کیفیت ارتباط حادث بالقدیم کسی قدر معلوم ہوگئی ہوگی اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ حقوق والد روحانی والد جسمانی کے حقوق سے کس قدر زیادہ ہیں اور کیوں نہ ہو وہاں اگر تولد جسمانی ہے تو یہاں حدوث روحانی ہے۔ وہاں اگر مداخلت ہے تو یہاں ضرورت ہے۔ پھر جب حقوق والدین جسمانی اس قدر ہیں کہ حقوق والدین مجملہ اکبر کبائر ٹھہرا تو حقوق والدین کتنے اور حقوق والد روحانی کیا ہوگا۔ بالجملہ جس قدر والد جسمانی مظہر خالقیت ومظہر ربوبیت ہے۔ اس سے زیادہ والد روحانی مظہر خالقیت ومظہر ربوبیت ہے۔ (آب حیات ص ۱۷۷)

حضرت مولانا آگے لکھتے ہیں: جیسے خداوند کریم بشہادت ''نحن اقرب الیہ من حبل الورید'' (ق:۱۶) منشاء انتزاع ممکنات ہیں۔ اس لئے کہ آیت گو بوجہ خطاب خاص انسان کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ پر حکم عام ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے ایسے ہی رسول اللہ ﷺ بشہادت ''النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم'' منشاء انتزاع ارواح مؤمنین ہیں اس لئے حقوق نبوی ﷺ حقوق والدین جسمانی سے بدارج زیادہ ہوں گے۔ (آب حیات ص ۱۸۴)

حضرت مولانا کی مراد ظاہر ہے کہ رسالت مآب کے حقوق جو والد روحانی ہیں والد جسمانی کے مقابلہ پر بدرجہا زیادہ ہیں۔ اس لئے کہ ایجاد ولد میں والد جسمانی سے والد روحانی کو جو منشاء انتزاع ارواح مومنین ہیں بدرجہا زیادہ دخل ہے۔ کیونکہ والدین اور والد جسمانی کے بغیر بھی آدمی کا وجود متصور بلکہ واقع ہے۔ جیسا حضرت آدم کا وجود اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ہے۔ مگر منشاء انتزاع کے بغیر انتزاعیات کا وجود ناممکن ہے۔ بلکہ جس طرح ممکنات اپنے حدوث اور بقاء میں وجود باری کے محتاج ہیں اور ممکنات کے حدوث اور بقاء کے لئے وجود باری کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ارواح مؤمنین اپنے حدوث وبقاء میں حضور ﷺ کے محتاج ہیں اور ارواح مومنین کے حدوث وبقا کے لئے حضرت رسالت مآب ﷺ کی ضرورت ہے۔

اگر حق تعالیٰ غیر قیوم اور غیر موجود فرض کرلیا جائے تو ممکنات کے حدوث وبقاء کا تصور بھی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر حضور ﷺ کی حیات کا زوال اور انقطاع فرض کیا جائے تو ارواح مومنین کا حدوث وبقاء کہاں سے اور کیسے متصور ہوگا اور مذکورہ نظریات کا ماخذ اور بحث کے دلائل قرآن شریف کی مذکورہ آیات ہیں جو حضرت مولانا کے کلام میں ذکر کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا بحث کرتے ہیں کہ موت وحیات میں تضائف اور ایجاب وسلب کا تقابل نہیں ہے بلکہ حسب ظاہر تقابل عدم وملکہ اور باعتبار اشارہ آیت ''خلق الموت والحیوۃ'' اور حدیث ذبح موت ان میں تقابل تضاد غالب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مخلوقیت صفات موجودات اور وجودات میں سے ہے۔ موت اور حیات میں خواہ تضاد ہو یا عدم وملکہ ہو۔ بہرحال حیات نبوی ﷺ قابل زوال نہیں ہے۔ بلکہ بوقت موت بھی قائم ہوتی ہے۔ مگر مستور ہو جاتی ہے۔ تقابل عدم وملکہ کی صورت میں اس استتار حیات میں رسالت مآب کو مثل

آفتاب سمجھ لیجئے کہ وقت کسوف اس کا نور مستور ہو جاتا ہے یا مثل شمع چراغ خیال فرمایئے کہ جب اس کو کسی ہنڈیا یا مٹکے میں رکھ کر اوپر سے سرپوش رکھ دیجئے تو اس کا نور بالبداہۃ مستور ہو جاتا ہے۔ مگر زائل نہیں ہو جاتا اور تقابل تضاد کی صورت میں رسالت مآب کے استتار حیات مثل آب سرد کی معمولی برودت ہے۔ جو آگ سے گرم کرنے کے وقت ہوتی ہے۔ آب سرد کی معمولی برودت جو اسباب حرارت کے نہ ہونے کے وقت ہوتی ہے۔ آگ سے گرم کرنے کے بعد زائل نہیں ہو جاتی ہے۔ البتہ حرارت کے پردہ کے نیچے مستور ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسباب حرارت کے الگ ہو جانے کے بعد کسی سبب خارجی کے بغیر معمولی برودت عود کر آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آب سرد کی معمولی برودت اس کی ذاتی ہے، قابل زوال نہیں ہے۔

حضور ﷺ کی روح اور بدن کا تعلق زائل نہیں ہوتا ہے

حضرت مولانا لکھتے ہیں: رہا جسد اطہر حضرت ساقی کوثر ﷺ سو ہر چند اس کی موت کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو وہی عروض موت، دوسرے زوال علاقہ روح اقدس و جسد مقدس ﷺ بالجملہ انفکاک علاقہ فیما بین روح پاک وجسد مصطفیٰ ﷺ ممکن ہے اور کیوں نہ ہو جو حادث ہے اس کا زوال بھی ہے اور اس کا عدم بھی وجود کے برابر مرتبہ امکان میں امکان رکھتا ہے۔ لیکن عالم اسباب میں کسی سبب کے ساتھ ارتباط مسبیت نہیں۔ یعنی جیسے عالم اسباب میں تنویر ارض وسماء کے لئے شمس وقمر احراق اجسام سوختنی کے لئے آتش حرارت پرور تبرید کے لئے آب تسکین خاطر کے لئے جواب باصواب خدائے مسبب الاسباب نے بنایا ہے۔ اسی طرح قطع علاقہ روح اطہر حیات ساقی کوثر ﷺ کے لئے کوئی سبب نہیں بنایا۔ (آب حیات ص ۲۱۱)

اور اس کی وجہ یہ فرمائی ہے کہ بدن کے ساتھ روح کو بغرض تکمیل روح تعلق ہے او وجس طرح کاتب کو بغرض کتابت قلم کی ضرورت ہے۔ یا نجار کو تیشہ وغیرہ کی حاجت ہے۔ ایسی ہی روح کو بغرض اتمام فاعلیت اور تکمیل مؤثریت بدن کے ساتھ تعلق کی حاجت ہے۔ اگر یہ آلہ بدن نہ ہو تو روح اپنے اعمال میں مثل معذوران بے دست و پا معذور ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ ایک کمال علمی ہے اور دوسرا کمال عملی اور در حقیقت مقصود کمال عملی ہے۔ مگر کمال عملی بدون وساطت کمال علمی متصور نہیں۔ اس لئے اس کی تکمیل بھی مطلوب ہے۔ قرآن شریف کی آیت ''وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون'' (الذاریات: ۵۶) اور ''وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین له الدین'' (البینۃ: ۵) اس بات کا گواہ ہے کہ مطلوب بالذات عمل ہے۔ عامل بے علم کا محمود خلائق ہونا اور عالم بے عمل کا مطعون عالم ہونا سب جانتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم آلہ عمل ہے اور روح اور بدن کے اس تعلق کا ثمرہ بدن کے حق میں فقط جسمانی حیات ہے اور جسم کی حیات بغرض عمل مطلوب ہے۔ قرآن شریف کی آیت ''خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا'' (الملک: ۲) سے ثابت ہوتا ہے کہ حیات کا اصل ثمرہ عمل ہے۔ حیات اصلی منشاء اور مبداء اعمال ہے اور حاصل حیات قدرت ذاتی علی الاعمال اور حاصل موت عجز عن الاعمال ہے۔ قدرت عملیہ اور قوت اختیاریہ جب رک گیا تو یہ موت ہے۔ اصل میں قوت عملی اور قدرت اختیاری حیات اور موت کا مورد ہے۔ اگر قوت عمل اور قدرت اختیار ہے تو زندگی ہے ورنہ موت ہے۔

سابق اوراق میں آپ نے پڑھا ہے کہ انبیاء علیہم عالم برزخ میں نماز پڑھتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو قوت عمل اور قدرت اختیاری حاصل ہے اور یہ ان کی جسمانی حیات کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ جسمانی حیات کا بالذات ثمرہ اور نتیجہ قوت عملی اور قدرت اختیاری ہے اور قرآن شریف کی اس آیت سے اس فکر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حیات اور موت کی حقیقت قوت عمل اور قدرت اختیاری ہے اور قرآن شریف کی اس آیت سے اس فکر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حیات اور موت کی حقیقت قوت عملی اور قدرت اختیاری ہے ''اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھاالموت ویرسل الاخریٰ'' (الزمر: ۴۲) میں حیات اور موت امساک اور ارسال قوت عملی ہے اور جب عمل کو ہم حیات کا ثمرہ کہتے ہیں تو اس سے مراد بالفعل حیات ہے۔ لہٰذا جہاں جسمانی اعمال دیکھتے اور جانتے ہیں تو اس کے لئے جسمانی حیات بالفعل لازم ہے اور روحانی حیات بالقوۃ جو عین قوت علمیہ ہے اور چیز ہے اور بدن کے ساتھ جو قوت علمیہ کا تعلق ہے۔ جس کو ہم جسمانی حیات بالفعل کہتے ہیں اور قوت علمیہ کے لئے روح کو اس بدن کے ساتھ تعلق کی ضرورت تھی اور چیز ہے۔ اگر عمل مفقود ہے تو بالفعل حیات نہیں ہے۔

مگر اس کے ساتھ یہ لازم نہیں ہے کہ بالقوۃ حیات کا ازالہ ہو چکا ہے اور قوت عملی باقی نہیں ہے۔ اگر موت کے وقت عجز عن الاعمال ہے تو ہو مگر اس سے لازم نہیں آتا کہ اصل حقیقت میں عجز ہے اور حیات وقوت عملی باقی نہیں ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی زور آور کے دبا لینے سے کمزوروں سے بعض افعال صادر نہیں ہو سکتے اور بظاہر عاجز سمجھے جاتے ہیں اور وہ مردہ نہیں کہلاتے۔ ایسے ہی رسول اللہ ﷺ اور انبیاء کرام علیہم السلام کو بوجہ عروض موت یا عدم اسباب ارسال باعتبار خارج عاجز سمجھئے اور میت سمجھئے باعتبار اصل حقیقت عاجز اور میت خیال نہ فرمایئے۔

اس کے بعد حضرت مولانا لکھتے ہیں کہ اس مقدمہ کے بعد سنئے: کہ تعلق کی دو قسمیں ہیں: ایک تعلق فعلی اور فاعلی اور دوسرا تعلق انفعالی اور منفعلی مثلاً نور کا تعلق آفتاب کے ساتھ فعلی ہے اور آفتاب کا تعلق نور کے ساتھ فاعلی ہے اور زمین کے ساتھ اسی نور کا تعلق انفعالی ہے اور زمین کا تعلق اسی نور کے ساتھ منفعلی ہے یا مثلاً نور کا تعلق شمع و چراغ کے ساتھ فعلی اور چراغ و شمع کا تعلق اسی نور کے ساتھ فاعلی اور زمین وغیرہ کے ساتھ اسی نور کا تعلق انفعالی اور زمین وغیرہ کا تعلق اسی نور کے ساتھ منفعلی ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ فاعل اور منفعل کے بیچ میں کوئی شئے حائل وحاجب ہوتی ہے تو وہ شئے مانع تعلق انفعالی و منفعلی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خود قائم مقام منفعل ہو جاتی ہے اور منفعل ہو جاتی ہے پر مانع تعلق فعلی و فاعلی نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی جسم قابل تعلق نور آفتاب اور زمین یا شمع و چراغ اور زمین کے مابین حائل ہوتا ہے تو وہ مانع تعلق انفعالی نور اور مانع تعلق زمین ہوتا ہے۔ یعنی اس تعلق کو زمین سے چھین کر اپنے تصرف میں لے آتا ہے۔ آفتاب و شمع چراغ کے ساتھ نور مذکور کو جو تعلق تھا وہ تعلق بدستور رہتا ہے۔ اس میں کچھ فرق نہیں آتا۔ بلکہ تعلق مذکور اور دوی ہو جاتا ہے۔ (آب حیات ص ۲۱۴)

غرض یہ ہے کہ آفتاب یا شمع و چراغ کے ساتھ آفتاب کے نور یا شمع کے نور کا جو تعلق تھا وہ اس وقت بھی بدستور باقی رہتا ہے جب کہ آفتاب یا شمع وغیرہ اور زمین کے درمیان کوئی جسم حائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی روح اور بدن کا تعلق فعلی اور فاعلی تعلق اس وقت بھی قائم ہے جب کہ موت کے پردہ کے نیچے حضور ﷺ کی حیات مستور ہو جائے اور اس کی مثال یہ ہے کہ پانی کو برف سے حد اصلی سے زیادہ سرد کر لیں یا پانی کو آگ سے حد اصلی سے زیادہ گرم کر لیں تو یہ

دونوں صفتیں پانی کی اصلی نہیں ہیں عرضی ہیں اور جب اس سبب خارجی آگ اور برف کا اثر ختم ہو جاتا ہے تو وہ زائل ہو جاتی ہیں اور پانی کا اصل برودت اور حد اصلی کی حرارت اس وقت بھی قائم تھی جب کہ برودت اور حرارت اصلی دونوں اپنی حد اصلی سے خارجی سبب کے وسیلہ سے متجاوز تھیں۔ اس لئے سبب خارجی کے اثر کے ختم ہونے کے بغیر کسی سبب کے اصلی برودت عائد ہو جاتی ہے یا چاندی پر سنہرا جھول اور سونے پر رروپہلا جھول دے کر چاندی کا اور سونے کا اصلی رنگ چھپا دیں۔ مگر چاندی اور سونے کا اصلی رنگ زائل اور جدا نہیں ہوتا۔ مستور ضرور ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت مولانا لکھتے ہیں: اور تعلق حیات بالبدن تعلق فعلی اور فاعلی ہے۔ چنانچہ ابھی عرض خدمت کر چکا ہوں تو اس صورت میں مانع تعلق قوت عملیہ بالاعمال تو متصور ہوگا۔ پر منع تعلق قوت عملیہ بالبدن جو مبداء افعال اور منشاء حیات ہے، متصور نہیں۔ ہاں اگر تعلق قوت عملیہ کا بدن کے ساتھ فقط تعلق فعلی اور فاعلی نہ ہو بلکہ تعلق انفعالی اور منفعلی بھی ہو تو اس وقت گو بجہت فعل و فاعل قوت مذکورہ کے تعلق کا ارتفاع ممتنع ہو پر بجہت انفعال و منفعل متصور ہے۔ سو یہ بات حیات جناب سرور کائنات ﷺ کے ساتھ تو متصور نہیں۔ کیونکہ آپ کی حیات مستعار نہیں۔ کسی دوسرے کا طفیل نہیں۔ پھر بہ نسبت حیات امت البتہ ممکن ہے۔ کیونکہ حیات روح مبارک ﷺ کو موافق مقتضائے تحقیقات سابقہ ابدان مومنین کے ساتھ تو تعلق انفعال و منفعلی ہے اور آپ کے بدن اطہر کے ساتھ تعلق فعلی و فاعلی ہے اور بناء حیات و موت قوت عملیہ پر ہے اور وہ قوت آپ میں ذاتی اور سوا آپ کے اوروں میں عرضی ہے۔ (آب حیات ص ۲۱۵)

اس کے بعد حضرت مولانا کہتے ہیں: مگر اس بناء پر یہ بات خوب روشن ہوگئی کہ مابین روح اطہر حضرت سرور عالم ﷺ اور جسد مطہر جناب رسالت مآب ﷺ کسی حائل اور حاجب کی گنجائش نہیں جو موت بمعنی انقطاع علاقہ حیات متصور ہو کیونکہ علاقہ روح و جسد حسب تحقیق تازہ فعلی ہے اور اس علاقہ کے انقطاع کی کوئی صورت نہیں۔ پھر مداخلت مانع و حاجب ہو تو کیونکر ہو۔ اس صورت میں یہ فرق ہاتھ لگا کہ تعلق حیات و بدن نبوی ﷺ قابل انفکاک نہیں۔ پھر موت جسمانی حضرت حبیب ربانی جو کسی طرح قابل انکار نہیں۔ بجز اس کے متصور ہی نہیں کہ حیات مذکور زیر پردہ موت مستور ہو جائے۔ اس لئے ممکن ہے کہ علاقہ روح و جسد نبوی ﷺ بوجہ اور علاقہ روح و جسد مومنین بے زوال انفعال معروضات خداوند کریم اپنی قدرت کاملہ سے توڑ ڈالیں۔

مگر وعدہ الٰہی یہ ہے کہ علاقہ روح و جسد نبوی ﷺ منقطع نہ ہوگا۔ چنانچہ ''ولا تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا'' (الاحزاب: ۵۳) بعد ملاحظہ اجازت عامہ جو درصورت موت ازواج آیہ ''والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا'' (البقرۃ: ۲۳۴) سے دربارہ نکاح متوفی عنہا زوجہا ثابت ہے۔ اس پر دلالت کرتی ہے یعنی علی العموم آیۃ ''یتوفون منکم'' تو بعد عدت درصورت زوال حیات انقطاع نکاح پر شاہد ہے۔ آیت ''لا تنکحوا ازواجہ'' حرمت نکاح ازواج مطہرات پر الی الابد دال ہے۔ پھر تطبیق کی بجز اس کے اور کیا صورت ہے کہ نکاح منقطع نہ ہوا ہو اور بقاء نکاح بے بقاء علاقہ روح و جسد متصور نہیں۔ مگر اجازت نکاح ازواج شہداء اور تقسیم اموال شہداء بقدر میراث جو احادیث صحیحہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ انقطاع حیات پر دال ہے۔ (آب حیات ص ۲۱۸)

اس تفصیل کی غرض اور خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی روح اور جسد کے درمیان جو تعلق اور علاقہ ہے وہ قابل زوال نہیں ہے۔ اس لئے کہ روح اور جسد کے درمیان کسی حائل اور حاجب کے لئے گنجائش نہیں ہے تو پھر

انقطاع حیات کا تصور ہو تو کیونکر ہو، جب کہ اس تعلق کا ارتفاع ممتنع ہوا یک طرف انقطاع حیات کا امتناع اور دوسری طرف بظاہر حضور ﷺ کی موت جسمانی جس کا انکار کسی نے نہیں کیا ہے اور نہ اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقوع اور اس امتناع کا تصور صرف اس صورت میں ہے کہ حضور ﷺ کی حیات زیر پردہ موت مستور ہے اور نیز حضور ﷺ کے بدن مبارک کے حق میں علاقہ فعلی حیات لازم وجود خارجی اور دائم بدوام ذات الموضوع ہے۔ لازم ماہیت نہیں ممکن الانقطاع ہے۔ مگر اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ علاقہ منقطع نہ ہوگا۔ چنانچہ ہمیشہ کے لئے اور عموم کے ساتھ حضور ﷺ کے ازواج مطہرات کے نکاح کی حرمت اس وعدہ پر شاہد عدل ہے کہ بقاء عالم تکلیفی تک حضور ﷺ کے بدن اور جسد کے درمیان علاقہ حیات قائم ہے۔ ورنہ آیت عدت متوفی کا عموم جو عدت کے بعد زوال حیات کی صورت میں انقطاع نکاح پر شاہد ہے۔ حضور ﷺ کے ازواج مطہرات کے حرمت نکاح الی الابد کی آیت سے منطبق نہیں ہو سکتی۔ حضرت مولانا نے تمام بحث میں کتاب اللہ کی آیات سے صحیح استدلال کیا۔ مگر ضرورت ہے کہ غائر نگاہ سے اس کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور پوری توجہ اور خالی الذہن ہو کر غور و فکر کی بصیرت میں سمجھنے کی کوشش کی جائے اور جس نے اس کو ماہنامہ سمجھ کر پڑھا ہے۔ اس نے شکایت کی ہے اور حضرت مولانا کا یہ گلہ کیا ہے کہ اس مسئلہ میں آپ منفرد ہیں۔ حالانکہ مولانا نے وہی لکھا ہے جو زرقانی رحمۃ اللہ علیہ، سبکی، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے منفرد ہونے کا معنی کیا ہے۔

ان حضرات محدثین کی طرح حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ حضرت شیخ لکھتے ہیں: بعض محققین علماء نے لکھا ہے کہ انبیاء کی عدم میراث کا مدار ان کی حیات پر ہے خصوصا سرور کائنات ﷺ کی میراث تو مردوں کی ہوتی ہے زندوں کی میراث نہیں ہوتی ہے۔ انبیاء چونکہ زندہ ہیں اس لئے ان کی میراث نہیں ہے اور آنحضرت ﷺ کے اموال آپ کے ملک میں ہیں جیسے کہ زندگی میں آپ کے ملک میں تھے اور ورثاء کے ملک میں آپ کے املاک منتقل نہیں ہوئے۔ جیسا کہ دوسرے اموات کے املاک ورثاء کے ملک میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ امام الحرمین نے اس قول کی تصحیح کی ہے اور فرمایا ہے کہ سیرت صدیق کے موافق یہی ہے اور فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی موت جمیع وجوہ اور معانی میں لازم نہیں ہے کہ ایسی موت ہو جیسے کہ عام اموات کی موت ہوتی ہے بلکہ حضور ﷺ کی موت حس اور شعور کے ذہاب اور تعطل کی حد تک موت ہے۔ (مداراج النبوۃ ج ۲ ص ۴ تا ۵۷۶،۵)

اور حضرت شیخ ذکر فضائل میں لکھتے ہیں: کہ حضور ﷺ کے املاک حضور ﷺ کے ملک میں باقی تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی نیابت کی حیثیت سے ان میں تصرف کرتے تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ کا ملک حضور ﷺ کے املاک پر باقی ہے۔ جیسا کہ امام الحرمین نے کہا ہے۔ (مدارج النبوۃ ج ۱ ص ۱۷۰)

٭ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو علم اور یقین تھا کہ حضور ﷺ کے املاک حضور ﷺ کے ملک میں ہیں تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو علم تھا اور جانتے تھے کہ بوقت موت بھی حضور ﷺ کی زندگی تھی ورنہ انقطاع زندگی کے بعد املاک پر حضور ﷺ کا ملک کیسا باقی اور قائم رہا۔ اس لئے اگر ملک کے زوال کے دوسرے اسباب مثلاً بیع ہبہ وغیرہ نہیں ہے تو زوال حیات زوال ملک کو مستلزم ہے۔

موت کی حقیقت کیا ہے

کہا جاتا ہے کہ موت کی حقیقت حیات کا ازالہ ہے اور حضور ﷺ کی موت کی حقیقت بھی آپ کی حیات

کے زوال کے سوا اور کچھ نہیں اور عرب میں سے کوئی بھی موت کا معنی انفکاک روح عن الجسد کے سوا دوسرا معنی نہیں جانتا۔ منکرین حیات کے گروپ میں ایک بڑا رکن اپنی کتاب (القول الجلی فی حیات النبی ﷺ ص ۴۳) میں ایسا لکھتے ہیں: میں نہیں جانتا کہ عرب اور غیر عرب میں کوئی ادیب اور لغوی ایسا بھی ہے جس کے علم وادب نے لغات کے ایک ایک محل اور استعمال پر احاطہ کیا ہے اور اس کے علم وادب نے کسی ایک لغت کے محل اور استعمال کو فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ حضور ﷺ رسالت مآب کی موت کی حقیقت دریافت اور سمجھنے کے لئے لغت کی امداد پر انحصار کیوں ہے اور جب کتاب وسنت میں انبیاء کی حیات عموماً اور رسالت مآب ﷺ کی حیات خصوصاً مذکور ہے تو کتاب وسنت میں موت کی حقیقت اور اس کے استعمال کے موارد سے انکار حیات کی ضد اور تمرد میں اہل اعتزال کا ہمنوا بن کر کتاب وسنت کی نصوص سے دیدہ دانستہ منکرین حیات نبوی کیوں آنکھ چراتے ہیں۔

قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے "اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخریٰ" (الزمر:۴۲) ترجمہ: (اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرایا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وعدہ مقرر تک)

قرآن شریف کی یہ آیت بتلاتی ہے کہ موت کی طرح نیند میں بھی جان کھینچتی ہے، نکالی جاتی ہے اور جس طرح موت میں انفکاک روح ہوتا ہے۔ اسی طرح نیند میں بھی انفکاک روح عن الجسد ہوتا ہے۔ مگر نیند بالکلیہ موت نہیں ہے۔ اس میں حیات کا ازالہ نہیں ہوتا ہے۔ نائم کا کھایا ہوا ہضم ہوتا ہے، نائم سانس لیتا ہے، چھوڑتا ہے نائم کی نبض چلتی ہے۔ قیام حیات کے آثار موجود ہیں۔ مگر جس روح کو اللہ نے قوت عمل اور قدرت اختیاری سے روکا ہے وہ موت ہے اور یہی امساک موت کی حقیقت ہے اور جس روح کو قوت عمل اور قدرت اختیاری واپس کر دیا ہے۔ یہی ارسال ہے اور حیات کی یہی حقیقت ہے۔ افعال حیات زندگی کی حقیقت ہے اور افعال حیات سے روح کا تعطل موت کی حقیقت ہے۔ اگر انفکاک روح عن الجسد موت کی حقیقت اور زوال حیات کو مستلزم ہے تو نائم مائت یا میت کہلانا چاہئے تھا اور اس پر موت کے احکام مثلاً ارتفاع نکاح وارتفاع ملک وغیرہ کو جاری کیا جاتا۔ اس لئے کہ نائم سے اس کی روح کو اس کے جسد سے اللہ تعالیٰ نے کھینچ لیا ہے نکال دیا ہے۔

اور بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الدعوات میں باب التعوذ والقرأۃ عند النوم میں ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے "ثم یقول باسمک ربی وضعت جنبی وبک ارفعہ ان امسکت نفسی فارحمھا وان ارسلتھا فاحفظھا بما تحفظ بہ الصالحین" ترجمہ: جب تم میں سے کوئی بستر پر آئے تو یہ دعا پڑھے۔ تیرے ہی نام پر اے میرے رب اپنے پہلو کو رکھتا ہوں اور تیرے ہی نام کے ساتھ اس کو اٹھاؤں گا۔ اگر تو میری جان کو روک لے تو اس پر رحم کیجیو اور اگر چھوڑ دے تو اس کی حفاظت کیجیو جیسے کہ تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔ (بخاری شریف ج ۲ ص ۹۳۵)

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نیند کے وقت روح نکالی جاتی ہے۔ اس کے بعد یا امساک ہے موت ہے یا ارسال ہے حیات ہے۔ بہر حال موت یا حیات اور امساک یا ارسال روح کے کھینچ لینے کے نکالے جانے کے بعد کے حالات اور واقعات ہیں اور امساک یا ارسال سے پیشتر انفکاک روح عن الجسد نوم کی حالت میں ہو چکا ہے۔ لیکن کتاب وسنت میں اس کو موت نہیں کہا گیا اور انفکاک روح عن الجسد کے باوجود بھی حیات کا انقطاع نہیں

ہوا ہے۔ ورنہ کتاب وسنت کی زبان میں وہ نائم نہیں بلکہ میت پکارا جاتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت کی حقیقت انفکاک روح عن الجسد نہیں ہے اور نیز یہ کہ انفکاک روح عن الجسد جیسے نوم میں ہوتا ہے۔ مگر ازالہ حیات نہیں کرتا۔ بلکہ روح کو جسد میں تدبیر وتصرف سے روکنا۔ اگر چہ جسد کے ساتھ اس کا علاقہ حیات قائم ہے موت کی حقیقت ہے۔

کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث میں امساک موت سے کنایہ ہے اور ارسال استمرار بقاء سے کنایہ ہے اور طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کتاب اللہ کی اس آیت کے موافق آیت ہے "اللہ یتوفی الانفس حین موتھا الخ" یعنی اس حدیث نے قرآن شریف کی طرح یہ بتلا دیا ہے کہ نیند میں روح نکالی جاتی ہے کسی کو روک لیا جاتا ہے کسی کو چھوڑ دیا جاتا ہے کسی کو موت دی جاتی ہے اور کسی کو زندہ واپس کیا جاتا ہے۔

اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے حدیث کے صریح الفاظ میں امساک اور ارسال کی جگہ موت اور حیات مذکور ہیں: "ان احییتنا فاحفظھا و ان امتھا فاغفر لھا" نسائی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اس کی تصحیح کی ہے۔ (فتح الباری ج ا ص ۱۰۶)

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ نفس ممسکہ اور نفس مرسلہ دونوں کو نیند میں کھینچ لیا گیا ہے۔ جس نفس نے اپنا وقت پورا کر دیا تھا اس کو روک دیا، جسد کی طرف نہیں واپس کیا گیا اور جس کا وقت ابھی باقی تھا اس کو جسد کی طرف واپس کر دیا تاکہ وہ اپنا وقت پورا کر دے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس تفسیری قول کو پسند فرمایا ہے اور فرمایا کہ قرآن وسنت میں اس کی تائید اور رہنمائی ہے۔ (کتاب الروح ص ۲۹)

حافظ کی غرض بھی یہی ہے کہ نائم کی روح نکالی جاتی ہے اگر اس کا وقت اور مدت حیات ابھی باقی ہے تو وہ جسد کی طرف واپس کر دی جاتی ہے۔ نوم کی حالت میں بھی نائم کا جسد روح بغیر رہتا ہے۔ مگر اس جسد میں زندگی قائم ہے۔ منکرین حیات نبوی کو کہاں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انفکاک روح عن الجسد کے سوا موت کا دوسرا معنی نہیں ہے اور اس حدیث میں عجلان بن سعید عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریقہ سے جامع ترمذی میں یہ مذکور ہے "الحمد للہ الذی عافانی فی جسدی ورد علی روحی" ترجمہ: سب خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے میرے جسد میں عافیت بخشی اور میری روح کو مجھے واپس لوٹا دیا۔ (ترمذی ابواب الدعوات ج ۲ ص ۱۷۶)

نووی کہتے ہیں اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں اس کی سند حسن ہے۔ جامع التفسیر میں بھی اس کے حسن کا اشارہ ہے۔ (فیض القدیر ج اول ص ۲۸۰)

نیند سے بیدار ہونے کے بعد حضور ﷺ نے مذکورہ دعا پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ موت سے جاگنے والے کو اس کی روح لوٹائی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اس کی روح لوٹانے سے پیشتر اس کی روح نکالی گئی تھی اور روح کے نکالے جانے کے بعد بھی وہ میت نہیں ہے بلکہ نائم ہے اور زندہ ہے۔ روح نوم کے بعد بھی رد کیا جاتا ہے۔ رد روح سے پہلے موت کا ہونا ضروری اور لازم نہیں ہے۔ اس حدیث میں نائم کی رد روح نے یہ ثابت کر دیا کہ جس حدیث میں حضور ﷺ کو صلوٰۃ وسلام کے وقت رد روح کا ذکر آیا ہے اور منکرین حیات نے اس سے رد روح سے پیشتر حضور ﷺ کی موت پر استدلال کیا ہے۔ ان کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بخاری رحمہ اللہ نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ جب اپنے بچھونے پر تشریف لے جاتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے "باسمک اموت

واحیی" تیرے نام ہی مرتا اور جیتا ہوں اور جب بیدار ہوتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے "الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا" (اس اللہ کی سب تعریف ہے جس نے ہم کو مرنے کے بعد زندہ کیا) (کتاب الدعوات باب مایقول اذا نام)

حضور ﷺ نے اس حدیث میں نیند سے بیدا ہونے کو حیات اور نوم کو اور نائم کو موت اور میت فرمایا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نوم میں اور نائم سے انفکاک روح عن الجسد ضرور ہوتا ہے۔ مگر روح کا نکالا جانا جسد اور روح کے درمیان علاقہ حیات کو منقطع نہیں کرتا بلکہ حیات قائم ہوتی ہے جیسا کہ نوم میں انفکاک روح کے باوجود نائم زندہ ہے اور اس وقت بھی اس کی زندگی باقی ہے۔ اس حدیث میں نوم اور نائم کو موت اور میت فرمانا ظاہر کرتا ہے کہ موت کی حقیقت انقطاع حیات نہیں ہے اور چونکہ نائم اپنی نیند میں اپنے اختیار اور حس وحرکت سے اور اطاعت واجتناب کے عمل اور انتفاع حیات سے معطل اور روکا گیا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس حدیث میں نائم کو میت اور نوم کو موت فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نست کی نگاہ میں افعال حیات سے روح کا تعطل موت کی حقیقت ہے۔ اگرچہ باطن میں درحقیقت قائم اور باقی ہے۔ مگر ظاہر میں تعطل ہے۔ اس کے ظاہر سے اس کے ظاہر کو موت اور میت کہا گیا ورنہ حقیقت میں وہ زندہ ہے اور زندوں کی طرح اس کے احکام باقی ہیں۔

اس کے علاوہ جامع الصغیر میں مسند دیلمی رحمہ اللہ سے یہ حدیث مذکور ہے: "اذا دخل اللہ الموحدین النار اماتھم فیھا اماتۃ فاذا اراد ان امسھم الم العذاب تلک الساعۃ" ترجمہ: (جب اللہ موحدین کو جہنم میں ڈال دے گا تو ان کو جہنم میں موت دے گا اور جب اللہ ان کو جہنم سے نکالنا چاہے گا تو ان کو اس وقت عذاب کی تکلیف چکھائے گا)

علامہ مناوی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: موحدین وہ لوگ ہیں جو عاصی مرے تھے۔ انہوں نے توبہ نہیں کی تھی اور معاف بھی نہیں کئے گئے تھے۔ ان پر حق تعالیٰ کا یہ لطف ہوگا اور صحیح ایمان اور توحید کے اثر کے اظہار کے لئے ان کے احساس اور شعور کو مار دے گا۔ ان کے احساس اور شعور کو معطل کر دے گا تا کہ ان کو جہنم کے عذاب کی تکلیف کا احساس نہ ہو اور جب ان کو حق تعالیٰ جہنم سے نکالنے کا ارادہ شفاعت یا رحمت سے کرے گا۔ اس وقت ان کے احساس وشعور کو بحال کر دے گا اور جہنم سے نکالنے کے وقت عذاب ان کے احوال کے مناسب زیادہ یا تھوڑا چکھا دے گا۔ (فیض القدیر ج اول ص ۲۵۳)

حدیث مذکور میں اگرچہ لفظ اماتھم ہے۔ مگر مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ان کو مردہ کیا۔ اس لئے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن کبش املح کی صورت میں موت کو لایا جائے گا اور جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا کیا جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ جنت والو دیکھو یہ جانتے ہو وہ کہیں گے یا اللہ ہم جانتے ہیں یہ موت ہے تو اس وقت موت ذبح کی جائے گی۔ جیسے کہ بکری ذبح کی جاتی ہے۔ جنتیوں کو اطمینان ہو جائے گا اور جہنمی مایوس ہو جائیں گے اور اس حدیث کے رجال نافع بن خالد کے سوا تمام بخاری کے رجال ہیں اور نافع بن خالد بھی ثقہ ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۳۹۵)

اور جامع ترمذی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مفصل یہ حدیث مذکور ہے کہ حق تعالیٰ تمام لوگوں کو ایک میدان میں اکٹھا کرے گا اور حق تعالیٰ کے کچھ سوال وجواب کے بعد پل صراط سے اہل جنت جنت میں پہنچ جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں گر کر پہنچیں گے۔ پھر حق تعالیٰ دونوں کو پکارے گا۔ بہشت والوں کو نکالے جانے کا

ڈر ہوگا اور دوزخیوں کو شفاعت کی توقع ہوگی۔ حق تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ دیکھو جانتے ہو یہ موت ہے۔ دونوں طبقہ بولیں گے۔ ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ موت ہے جو ہم پر لازم کردی گئی تھی۔ اس وقت موت کو ذبح کیا جائے گا اور کہا جائے گا جنتیوں کو جنت میں خلود ہے، موت نہیں ہے اور اے دوزخیو! تم یہاں ہمیشہ کے لئے رہو گے۔ موت نہیں آئے گی وہ ذبح کی گئی۔ ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۹۷)

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ بہشت میں اور دوزخ میں اہل خیر اور اہل شر کو پہنچانے کے بعد نہ بہشت میں موت ہے اور نہ دوزخ میں موت ہے۔ بلکہ موت کے نام و حقیقت کو ختم کردیا جائے گا تو یہ کیسے خیال ہوسکتا ہے کہ دوزخ میں حق تعالیٰ ان لوگوں کو موت دے گا جن کو اپنے رحم اور لطف سے جہنم کا عذاب محسوس کرنا نہیں چاہتا ہے۔ جہنم کے عذاب کی تکلیف سے بچانے کے لئے اتنا کافی ہے کہ ان کو بے حس، بے شعور بنادے۔ قیامت کے دن اٹھائے جانے کے بعد حیات اور موت کا سوال ہی نہیں۔ نہ کسی کو موت دی جاتی ہے اور نہ کسی کی روح نکالی جاتی ہے ''لایذوقون فیھا الموت الا الموتة الاولی'' (الدخان:۵۶) ترجمہ: (نہ چکھیں گے وہاں موت مگر جو پہلے آچکی، موت جو دنیا میں آچکی وہ آچکی اب آگے کبھی موت نہیں) ''ربنا امتنا اثنتین و احییتنا اثنتین'' (المؤمن:۱۱) ترجمہ (بولیں گے اے ہمارے رب تو موت دے چکا ہم کو دو بار اور زندگی دے چکا دو بار)

پہلی موت اور انقضاء آجال کے وقت دوسری موت، جیسے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے اور انقضاء آجال کے بعد تیسری موت کے لئے کتاب وسنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ غرض یہ کہ موحدین میں جہنم میں زندگی موجود ہونے کے باوجود جہنم کے عذاب سے ان کے بے حس اور بے شعور کردینے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے موت فرمایا اور ان کو اموات فرمایا ہے تو ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ جہاں ظاہر میں زندگی کے آثار عمل اور احساس وشعور کو معطل کردیا جائے تو یہ موت کی حقیقت ہے۔ اگرچہ باطن اور حقیقت میں زندگی موجود ہے۔ جیسے کہ موحدین میں باطن اور حقیقت میں زندگی موجود تھی۔ اس لئے کہ جہنم میں نہ ان کی روح کا انفکاک ان کے اجساد سے ہوسکتا ہے اور نہ ان کی حیات کا بالکلیہ ازالہ متصور ہے۔

بات یہ ہے کہ انفکاک روح یا ازالہ حیات کو موت کی حقیقت بتلانا جیسے منکرین حیات بتلاتے ہیں بڑی غلطی ہے۔ اس لئے کہ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کی حقیقت کا تقاضا سبق حیات بتلایا گیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ حیات کے موجود ہونے کے بعد اس کو معدوم کردینا موت کی حقیقت سمجھی گئی ہے۔ لیکن قرآن شریف میں ایسی اشیاء پر اموات کا اطلاق مذکور ہے۔ جن میں سبق حیات نہیں ہے کہ ان کی موت نے ان کے سابق حیات کو ازالہ کردیا۔ پھر مسبوقیت یا حیات موت کا تقاضا اور ازالہ حیات موت کی حقیقت کیونکر صحیح ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ مشرکین کی حماقت کی بحث میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اللہ کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ''اموات غیر احیاء'' مردے ہیں جن میں جان نہیں۔ غیر احیاء خبر بعد خبر ہے یا صفت اموات ہے۔ اس سے غرض تاکید ہے یا یہ مراد ہے کہ تمہارے اصنام فی الحال بھی مردے ہیں اور پہلے بھی مردے تھے اور آئندہ کے لئے بھی قابل حیات نہیں ہیں۔ چونکہ اصنام کی موت میں مسبوقیت بالحیات نہیں ہے۔ اس لئے یہاں ازالہ حیات کا

تصور بھی نہیں ہے اور موت کی حقیقت اس آیت سے ثابت ہوتی ہے "جعل الشئی عادم الحیاۃ" کسی شئے کا ایسا ہونا جس میں زندگی نہ ہو خواہ اس میں پہلی زندگی تھی یا نہ تھی۔

دوسری مثال: "کیف تکفرون باللہ و کنتم امواتاً" (البقرۃ: ۲۸) ترجمہ: (کس طرح کافر ہوتے ہو خدائے تعالیٰ سے حالانکہ تم مردہ تھے، بے جان تھے پھر زندہ کیا تم کو) اس آیت میں موت سے مراد وہ عدم ہے جو احیاء اور خلق سے پہلے تھا۔ جیسا کہ ابن عباس ﷠ اور ابن مسعود ﷜ اور مجاہد ﷫ نے فرمایا ہے۔ چونکہ احیاء اور خلق سے اوّل پیشتر زندگی نہیں تھی صرف موت ہے۔ اگر موت کی حقیقت ازالہ حیات ہے تو اس موت نے کہاں کا ازالہ حیات کیا ہے اور نہ روح کا تعلق تھا تو انفکاک روح موت کی حقیقت کیسی ہے۔ اس کے علاوہ انفکاک روح ازالہ حیات موت کی حقیقت اس قرار واقعی کی بناء پر بتلایا جاتا ہے کہ موت اور حیات میں تقابل عدم والملکہ اور موت کو عدمی تسلیم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قدر یہ اور بعض اہل سنت کا خیال ہے اور اگر موت و حیات میں تقابل تضاد ہے اور موت صفت وجودیہ ہے۔ اس لئے کہ متعلق خلق ہے "خلق الموت و الحیاۃ" چونکہ اعدام ازلی ہیں۔ ان کے ساتھ خلق متعلق نہیں ہوتا۔

اکثر اہل سنۃ والجماعت اس کے قائل ہیں تو پھر موت میں انفکاک روح اور ازالہ حیات کا سوال نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف عدم حیات موت کی حقیقت ہے۔ "عما من شانہ ان یکون حیا" کے اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر تقابل عدم والملکہ تسلیم بھی کیا جائے۔ مگر وقت کی قید کے بغیر اس سے اعم اور تقابل حقیقی ہے تو سبق حیات کے بغیر بھی موت کا حقیقی اطلاق ہوتا ہے اور ازالہ حیات سابق کے بدوں موت ثابت ہوتی ہے اور مسبوقیت بالحیات کا اقتضاء لازم اور ضروری نہیں ہے۔

غرض یہ کہ مسبوقیت بالحیات موت کا لازم اقتضاء نہیں ہے۔ کہیں پایا جاتا ہے اور کہیں نہیں پایا جاتا اور نیز حیات سابق کا ازالہ موت میں ضروری نہیں ہے۔ کہیں انقطاع حیات ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ جہنم میں موحدین کی موت اور نوم میں نائم کی موت شارع کی زبان میں موت ہے۔ مگر صرف اس قدر ہے کہ نوم میں نائم کے اختیار اور احساس کو اور جہنم میں مؤحد کے حس اور شعور کو معطل کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف میں رسالت مآب کو "انک میت" کا خطاب اور صدیق اکبر ﷜ کی تقریر میں فقد مات محمد کا ارشاد صرف اس قدر ہے کہ حضور ﷺ کی ظاہری حیات کے ظاہری آثار قدرت اختیار انتفاع حیات کو اس نے روک دیا ہے۔ مگر یہ ضروری اور لازم نہیں ہے کہ اس خارجی اور عارضی عجز نے درحقیقت عجز اور انقطاع حیات بھی کر دیا ہے۔

اور اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شمع یا چراغ پر ڈھکنا رکھ دیجئے تو اس شمع یا چراغ کی روشنی پھیلنے سے رک گئی ہے۔ مگر وہ روشنی گل نہیں ہوئی ہے۔ شمع یا چراغ میں اس وقت بھی موجود ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی حیات کو عروض موت نے زیر پردہ ضرور کر دیا ہے۔ مگر بالکلیہ اس کو منقطع نہیں کیا ہے۔ دیکھئے سکتہ میں کیا ہوتا ہے۔ سب کچھ معطل ہے اور اشتباہ موت ہے۔ مگر حیات باقی ہے اور ضرور قائم ہے اور اس کی وجوہات کہ عام اموات کی طرح حضور ﷺ کی موت میں انقطاع زندگی اور ازالہ حیات نہیں ہے بلکہ زیر پردہ موت استتار حیات حضور ﷺ کی موت ہے اور عام اموات کی موت میں انقطاع حیات ہے۔ ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ موت کے وقت اور موت کے بعد اپنے مال میں کسی میت کو حق باقی نہیں رہتا اور نہ وہ مالکانہ

تصرف کرنے کا مجاز ہے۔ مصعب بن سعد عن سعد فرماتے ہیں: میں بیمار تھا اور حضور ﷺ عیادت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ میں نے کہا میں کل مال کی وصیت کرتا ہوں۔ حضور ﷺ نے انکار فرمایا میں نے کہا دو ثلث کی وصیت کرتا ہوں۔ حضور ﷺ نے انکار فرمایا۔ میں نے کہا ایک ثلث کی وصیت کرتا ہوں۔ حضور ﷺ خاموش رہے۔ (مسلم، بیہقی کتاب الوصیت)

ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا تمہیں وفات کے وقت اللہ تعالیٰ نے تمہارے اموال میں صرف ثلث کا حق اور ثلث میں تصرف کرنے کا حق دیا ہے۔ (سنن کبریٰ)

ان حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصی اپنی زندگی میں اگر یہ چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد کل مال یا تہائی یا دو ثلث اس کا مال جس کو وہ چاہتا ہے دے دیا جائے تو شارع نے اس کے ایسے عام تصرف کو روکا اور اس کے ملک کو اس قدر محدود اور کمزور کر دیا ہے کہ ایک ثلث سے وہ آگے نہیں بڑھتا اور اگر کسی نے ثلث سے زیادہ کی وصیت کی اور اس کو اپنے ملک پر اس قدر زعم تھا کہ اس کے مرنے کے بعد تقسیم مال کا اس کو اختیار ہے۔ چاہے وہ تقسیم کر دے۔ اگر زندگی میں اس نے ایسا چاہا اور وصیت کی ہے۔ مگر شارع نے اس کے اس زعم کو باطل کر دیا ہے اور اس کی ایسی وصیت کو اس کی زندگی میں ناجائز اور مسترد فرمادیا ہے۔

چنانچہ عمران بن حصین فرماتے ہیں: کہ ایک صاحب نے موت کے وقت اپنے چھ غلام آزاد کئے اور اس کے پاس ان غلاموں کے سوا اور کوئی مال نہیں تھا تو حضور ﷺ کو یہ بات پہنچی تو اس کو سخت بات فرمائی اور ان غلاموں کو بلایا اور ان کے تین ٹولے بنائے اور ان میں قرعہ اندازی فرمائی۔ ان میں سے دو کو آزاد کر دیا اور چاروں کو غلام رکھا۔ (سنن کبریٰ کتاب الوصایا، صحیح مسلم)

یہ وصیت چونکہ کل مال کی تھی۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس کی زندگی میں اس کو مسترد فرمایا اور ابھی اس کی زندگی باقی تھی کہ اس کے ملک کے اختیار و تصرف کو ثلث تک محدود فرمایا اور جب موت واقع ہو جاتی ہے اور اس نے وصیت نہیں کی تو پھر اس قدر بھی ملک باقی نہیں رہتا ہے بلکہ اس کے مال سے اس کا ملک بالکلیہ مرتفع ہو جاتا ہے اور اس کے اموال اس کے وارثوں کو منتقل ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے "للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون" (النساء:۷) ترجمہ (مردوں کا بھی حصہ اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے)

ماں باپ اور دیگر قرابت والوں کے ترکہ میں جو مر کر چھوڑ رہے بیٹوں کی طرح بیٹیوں کا بھی حق ہے اور ترکہ میں سب سے زیادہ قریب کے وارثوں کا یہ حق اور اس کا تقرر و تعیین اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس آیت کی یہ مراد ظاہر ہے کہ ماں باپ یا دیگر اقارب جب مرتے ہیں تو ان کے اموال بوقت موت ترکہ ہیں اور ان کا ترکہ ان کے وارثوں کو اس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ جس طرح حق تعالیٰ نے حسب تفاوت وارثوں کے حقوق مقرر اور متعین فرمائے ہیں۔ میت کا حق اور ملک اٹھ چکا ہے۔ اب وارثوں کے ملک اور حق میں وہ اموال آچکے ہیں۔

عتبہ بن عامر فرماتے ہیں: کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور کہا اللہ کے رسول میری ماں فوت ہو گئی اور اس نے کچھ زیورات چھوڑے ہیں۔ کیا میں ان کو اس کی طرف سے صدقہ کر دوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیری ماں نے تجھے صدقہ کرنے کا امر دیا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کا ترکہ اپنے لئے رکھ دے۔

مراد یہ ہے کہ اب وہ ترکہ تیرے لئے ہے تو اس کا مالک ہے تیری ماں کا ملک ختم ہو گیا ہے۔ مجمع الزوائد میں اس حدیث کا یہ عنوان باندھا ہے۔ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے مال میں ملک اس کا نہیں رہتا۔ (ج ۴ ص ۲۲۶) بلکہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ موت اموال میں حق اور ملک کا انقطاع کرتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ بوقت موت حضور ﷺ کے اموال میں حضور ﷺ کا حق تصرف اور ملک باقی تھا یا حضور ﷺ کی موت نے ملک اور حق تصرف کو زائل اور منقطع کر دیا تھا۔

صحیح بخاری کتاب الفرائض میں حضرت مالک بن اوس رضی اللہ عنہ کے مفصل بیان میں یہ مذکور ہے کہ حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمن بن عوف اور زبیر بن عوام اور سعد بن وقاص، حضرت عباس، حضرت علی کو حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) نے اندر آنے کی اجازت دی اور فرمایا میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس کے حکم سے آسمان وزمین قائم ہیں۔ تم جانتے ہو کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے ہمارا کوئی وارث نہیں ہے جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔ ان سب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا بیشک حضور ﷺ نے ایسا فرمایا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا فرمایا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ دونوں کا یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مطلب ایک ہے۔ عباس رضی اللہ عنہ! آپ مجھ سے اپنے بھتیجے کے مال میں سے حصہ مانگتے ہیں اور علی رضی اللہ عنہ! آپ اپنی بیوی کا حصہ حضور ﷺ کے مال میں سے مانگتے ہیں۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے حکم سے آسمان وزمین قائم ہیں۔ میں ایسا فیصلہ قیامت تک نہ دوں گا۔ (بخاری کتاب الفرائض و کتاب فرض الخمس)

اور ترمذی رحمہ اللہ نے شمائل میں (ص ۲۹) اور جامع (۱۹۴) باب السیر میں روایت کیا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا۔ آپ کی میراث آپ کی اولاد اور اہل کو ملے گی تو میں اپنے والد سے میراث کیوں نہیں لوں گی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ نے فرمایا "لا نورث" ہم سے کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہماری میراث نہیں ہوتی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے اموال میں میراث کا مطالبہ کیا تھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ جواب دیا کہ حضور ﷺ کے اموال محل موروثیت نہیں ہیں۔ حضور ﷺ کے اموال میں وارثوں کے لئے ارث کے حقوق قائم نہیں ہوتے۔ بلکہ حضور ﷺ جن کی عیالداری کرتے تھے ان کی عیالداری کی جائے گی اور حضور ﷺ جن پر خرچ کرتے تھے ان پر خرچ کیا جائے گا۔ جیسے کہ ترمذی اور مسند احمد میں ہے۔ بخاری کتاب الفرائض میں اور مؤطا امام مالک "ماجاء فی ترکة النبی" میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مذکور ہے "لا یقتسم ورثتی دینارا ما ترکت بعد نفقة نسائی ومؤنة عاملی فهو صدقة" ترجمہ (میرے بعد میرے وارث ترکہ کو تقسیم نہ کریں گے جو میں چھوڑ جاؤں اپنی بیبیوں کی خوراک کے بعد اور عامل کے خرچ کے بعد وہ سب صدقہ ہے)

حافظ ابن حجر کہتے ہیں سبکی کبیر فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے ورثتی فرما کر یہ بتلا دیا ہے کہ ارث کی وجہ سے حضور ﷺ کا ترکہ تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ ارث اس حکم کی علت ہے۔ حضور ﷺ سے ارث میں حضور ﷺ کے اموال کا اقتسام منفی ہے۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۵)

اور اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو مورث کے وارث نہ ہوں اور یا مورث زندہ ہے۔ پہلی صورت تو نہیں۔ حضور ﷺ کے ایسے اقربا ضرور تھے تو دوسری صورت متعین ہے۔ یعنی حضور ﷺ کی زندگی موت کے وقت قائم اور باقی تھی۔

ظاہر ہے کہ ترکہ اس وقت ہوتا ہے جب موت ہو جائے، موت کے ہو چکنے کے بعد اس کا ملک باقی نہیں ہوتا بلکہ ترکہ پر حسب قرب و بعد وارثوں کا ملک قائم ہو جاتا ہے۔ مگر حضور ﷺ کے املاک پر وارثوں کا ملک قائم نہیں ہوا۔ بلکہ آپ کے ملک میں ہیں۔ اس لئے آپ عروض موت کے بعد ان کو صدقہ کرتے ہیں۔ ملک کے بدوں صدقہ نہیں ہوتا ہے۔ آپ کا ملک قائم ہے۔ اس لئے وارثوں کو آپ کے اموال منتقل نہیں ہوتے۔ عدت کے بعد متوفی کے اموال میں بیوی کے لئے نفقہ کا حق نہیں ہے اور حضور ﷺ کے اموال میں عروض موت کے بعد ازواج مطہرات کے لئے آپ نے نفقہ قائم رکھا۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ عروض موت کے بعد آپ کا ملک بدستور قائم تھا۔ جیسا کہ (زرقانی شرح مواہب ج ۵ ص ۳۳۲) اور (سنن کبریٰ ج ۷ ص ۶۵) میں مذکورہ محدثین کو عروض موت کے بعد حضور ﷺ کے ملک کے قیام کا اعتراف اور قیام ملک بدوں حیات ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی موت عام اموات کی موت کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ عروض موت کے وقت اور بعد میں بھی آپ کی حیات بدستور قائم تھی۔

دوسری وجہ کہ حضور ﷺ کی موت عام اموات کی طرح نہیں ہے یہ ہے کہ عدت متوفی عنہا زوجہا کے بعد میت کی بیوی کو نکاح کرنے کا اختیار ہے عدت کے بعد اگر وہ چاہتی ہے تو پہلے خاوند کی موت نے اس کے ملک نکاح کو زائل کر دیا ہے۔ دوسرا نکاح وہ کر سکتی ہے اور یہ عام حکم ہے۔ اس کے عموم کی تخصیص قرآن کی اس آیت یا کسی دوسری آتی میں مذکور نہیں ہے۔ لیکن حضور ﷺ کے بعد بھی ازواج مطہرات کو نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے اور ہمیشہ کے لئے ازواج مطہرات کے نکاح کی حرمت کا قرآن شریف نے اعلان فرمایا ہے اور ان آیات میں قرآن شریف نے یہ بھی ظاہر فرما دیا ہے۔ اگر ازواج مطہرات سے کچھ کام کی چیز مانگنے جاؤ تو پردہ کے پیچھے مانگ لو۔ پس پردہ کھڑا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ازواج مطہرات احترام و تعظیم میں تمہاری مائیں ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ازواج مطہرات کی حرمت لازم ہے۔ لیکن اپنی ماؤں کی طرح ازواج مطہرات کی امومت کے احکام نہیں ہیں۔ اپنی ماؤں کے پاس پس پردہ بیٹھنا اور کچھ مانگنا تم پر ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ ازواج مطہرات کے لئے لازم کیا گیا ہے اور نیز ظاہر فرمایا کہ تمہیں اللہ کے رسول کو تکلیف دینا لائق نہیں اور حضور ﷺ کو ایذا اور تکلیف دہ حرکات میں سے بہت سخت اور بڑا بھاری گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص ازواج مطہرات سے آپ کے بعد نکاح کرنا چاہے۔ اس کا متبادر معنی یہ ہے کہ ازواج مطہرات سے نکاح کرنے کا ارادہ حضور ﷺ کو ایذاء اور تکلیف دہ حرکت ہے اور اللہ کے یہاں بڑا بھاری گناہ ہے۔

ازواج مطہرات کی یہ مخصوص حرمت رسالت مآب ﷺ کے تعلق نکاح کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔ بجز اس کے اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے اور ازواج مطہرات کے نکاح میں حضور ﷺ کی ایذاء کا بنیادی اور محکم تصور نہیں ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات سے حضور ﷺ کے نکاح کا تعلق ابھی قائم ہے۔ عروض موت کے بھی ازواج مطہرات کے نکاح کی حرمت حضور ﷺ کے بقاء نکاح کی دلیل ہے اور بقاء نکاح قیام حیات کے بدوں متصور نہیں ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کی موت نے عام اموات کی طرح حضور ﷺ کی حیات کو زائل نہیں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ مگر اپنی نسبت سے نہیں ورنہ حضور ﷺ کے تعلق سے پیشتر بھی ان کی یہ حرمت ثابت ہوتی بلکہ ازواج مطہرات حضور ﷺ کے تعلق اور نسبت سے ہماری مائیں ہیں اور اس کا معنی یہ ہے۔

حافظ ابن کثیر ﷫ ''وازواجہ امہاتھم'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ازواج مطہرات حرمت اور احترام میں

اکرام وتوقیر میں امت کی مائیں ہیں لیکن جس طرح اپنی ماں کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا جائز ہے۔اس طرح خلوت میں بیٹھنا ازواج مطہرات کے ساتھ جائز نہیں ہے اور جس طرح اپنی ماں کی بہنیں اور بیٹیاں خالائیں اور بہنیں بنتی ہیں اور حرام ہوتی ہیں۔اسی طرح ازواج مطہرات کی بیٹیاں اور بہنیں مسلمانوں کی بہنیں اور خالائیں نہیں بنتی ہیں اور حرام نہیں ہیں۔اسی طرح سید آلوسی ﷫ نے روح المعانی میں اس اضافہ کے ساتھ لکھا ہے: کہ ازواج مطہرات میراث کے بارے میں اپنی ماؤں کی مانند نہیں ہیں بلکہ اجنبیات ہیں۔ان میں سے مسلمانوں کو میراث نہیں ملتی۔

اور اسی طرح بیہقی ﷫ نے سنن کبریٰ (ج ۷ ص۶۹) میں خوب تفصیل سے لکھا ہے۔اگر چاہو تو مراجعت کر لیجئے۔غرض یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے نکاح کی حرمت کی وجہ یہ نہیں کہ وہ امہات المؤمنین ہیں۔قرآن شریف میں ارشاد ہے''ان امہاتھم الا الّٰئی ولدنھم''(المجادلہ:۲)ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔چونکہ ازواج مطہرات مسلمانوں کی حقیقی مائیں نہیں ہیں۔اس لئے ان کے نکاح کی حرمت کی وجہ بھی ان کی اموت نہیں ہے۔بلکہ رسالت مآب ﷺ کی حیات کا دوام واستمرار ہے۔منکرین حیات کو برزخ میں بھی دوام حیات کا انکار ہے۔جیسے کہ حیات علی الاتصال کا انکار کرتے ہیں اور دوام حیات اور حیات علی الاتصال اور آیت''انک میت''اور''کل نفس ذائقة الموت''میں ان کو تعارض کا شبہ ہے اور ان کو حضرت مولانا نانوتوی ﷫ کے معنی مراد پر شبہ ہے۔اس لئے میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کی عبارت کو یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں۔جس میں شبہ تعارض کے جواب کے علاوہ اور مزید فوائد بھی ہیں۔

حضرت مولانا لکھتے ہیں: نور آفتاب ہموارہ بیک حال است وایں فرق کسوف وعدم کسوف ہمچو استتار اوزیر پردہ وانکشاف آں است۔چنانچہ بر ماہران علم ہیئت پوشیدہ نباشد ہمچناں حیات وموت آن کبش کہ روز جزا بین الجنة والنار ذبح کردہ خواہد شد ذاتی باید دانست وحیات وموت دیگراں را خارجی وعرضی ویں فرق از ابوۃ روحانی انبیاء علیہم السلام کہ از جملہ''النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم''ماخوذ است باید دریافت چہ اموت ازواج مطہرات موقوف برابوۃ نبوی است ﷺ وابوۃ جسمانی آنحضرت ﷺ بہ نسبت جملہ مومناں امت مرحومہ معلوم ناچار بابوت روحانی اعتراف لازم آید وظاہر است کہ ارواح ایں قسم فاعلیت ومفعولیت وفعل وانفعال کہ موقوف برآلات ومحالات معلوم است متصور نیست بجز اینکہ مابین ارواح انبیاء وارواح امت رابطہ فیما بین آفتاب وقمر وقطعات نور ارضی باشد کہ درحرف مادھوپ وچاندنی نامند۔صحیح ایں ابوۃ نتواں کرد۔

ازیں تقریر دریافتہ باشی کہ اتصال حیات باارواح انبیاء مفاد قضیہ ضروریہ است واتصال حیات بااجسام اوشان مفاد قضیہ دائمہ۔مگر ایں قدر من خود عرض میکنم کہ وقتیکہ کیفیت حیات جسمانی وروحانی اوشان چنیں باشد درصورت عروض موت حاجت تصور انفکاک حیات از اجسام ہیچ نیست بلکہ نشاید آنچہ تصورش بہر اطمینان دربارہ حیات وموت کہ اول بوجہ دلائل معروضہ واجب التسلیم است ودوم بوجہ ارشاد''کل نفس ذائقة الموت''وہدایت آیت''انک میت''واجب الایمان ضروریست۔ایں قدر است کہ چنانکہ اجتماع برودت ذاتیہ واجتماع حرارت خارجہ از آب گرم میشود است یا اجتماع نور اصلی وظلمة عرضی در شمس وقت کسوف یا اجتماع نور قمر کہ سواء اوقات خسوف دائمی است وظلمت اوقات ابر کہ بہ نسبت آں عرضی است معلوم ہمچناں اگر اجتماع حیات ارواح اوشاں یا موت آنہا واجتماع حیات اجسام اوشاں یا موت آنہا باشد چہ حرج است کہ در قصہ شمس وقمر گزارش نیست۔ہمیں امکان اجتماع را در حیات وموت می باید کشید،وقت مشاہدہ آثار موت انبیاء باجتماع موت

عرضی و حیات ذاتی ایمان آور دگر ہویدا است کہ بقاء حیات بے بقا علاقہ فیما بین واجسام متصور نیست نظر برایں فقط بجر د ومشاہدہ آثار موت حکم انفکاک علاقہ مذکور نباید کرد مگر بوجہ نصوص۔ (فیوض قاسمیہ ص ۲۱،۱۸)

حضرت مولانا نانوتوی ﷫ کو حضور ﷺ کی حیات علی الاتصال پر جس قدر اصرار ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کو اس میں کچھ بھی شک یا شبہ نہیں تھا اور جس شوق اور روانی سے حضرت مولانا اس پر بحث کرتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کے علم اور وجدان کو اس پر یقین اور قطعی اعتماد ہے۔

چنانچہ جمال قاسمی میں لکھتے ہیں: انبیاء علیہم کی ارواح طیبہ کو بعد مرگ بھی وہی تعلق اپنے اجسام سے رہتا ہے جو قبل مرگ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اجسام مثل اجسام احیاء پھولتے پھلتے نہیں۔ چنانچہ احادیث میں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ازواج مثل ازواج احیاء اوروں سے نکاح کرنے کا اختیار نہیں رکھتیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اموال مثل اموال احیاء ان کے وارث تقسیم نہیں کر سکتے اور اس وجہ سے حدیث لانورث کو معارض آیت یوصیکم اللہ اور آیت لاتنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا کو معارض آیت والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ آیت ''یوصیکم اللہ'' اور آیت ''والذین یتوفون'' کے مصداق وہ ہیں جن کی ارواح کو ان کے ابدان کے ساتھ وہ تعلق نہ رہا جو حالت حیات میں تھا۔

چنانچہ ''للرجال نصیب مما ترک الوالدان'' (النساء: ۷) میں لفظ ترک اور آیت ''والذین یتوفون منکم'' (البقرۃ: ۲۴۰) میں مادہ توفی اس پر شاہد ہے۔علیٰ ہذا القیاس آیت ''ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم'' (النساء: ۹) میں لفظ ترکوا قرینہ مضمون معروض ہے۔ کیونکہ جیسے مضمون توفی جبھی چسپاں ہوسکتا ہے جب کہ کوئی چیز نکال لی جائے اور یہ بات اس وقت صحیح ہوسکتی ہے جب روح کو بدن سے نکال کر باہر کیجئے۔ کیونکہ الذین کا مصداق آیت یتوفون میں وہی ہے اور نیز وہ نہ ہو تو جسم ہوا اور ظاہر ہے کہ جسم مورد توفی وقت مرگ نہیں ہوتا۔اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ روح کو ایسے لوگوں کے اپنے جسم سے وہ علاقہ نہیں رہتا جو وقت حیات تھا۔ایسے ہی مضمون ترک بھی گرفتاران محبت اولاد و اموال کے حق میں جبھی صحیح ہوسکتا ہے جب کہ اس خاکدان سفلی کو چھوڑ کر عالم علوی کو چلی جائیں۔ سو یہ جبھی ہی متصور ہے جب کہ روح کو وہ تعلق اوّل نہ رہے ورنہ وہ ترک نہیں بلکہ مثل بندیوان دست و پا ملاقات اولاد و تصرفات اموال سے مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیدیوں کے ازواج و اموال ان کے ملک سے خارج نہیں ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ سکتہ والے کی ازواج و اموال بدستور اس کے ملک میں باقی رہتے ہیں۔ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ قیدیوں کے اجسام مقید ہوتے ہیں اور سکتہ والے کی روح مقید ہوجاتی ہے۔مگر اس قید خانہ میں جسم خاکی ہوتا ہے۔اس لئے وہ پھیلاؤ جو بذریعہ ظہور افعال اختیاریہ ہوا کرتا ہے اور نور قمر و آفتاب کے مشابہ ہوتا ہے۔ایسی طرح بند ہوجاتا ہے جیسے چراغ پر کسی ظرف کے رکھ دینے کے وقت اس کے نور کا پھیلاؤ بند ہوجاتا ہے۔سو یہی صورت بعینہٖ انبیاء علیہم کی موت کی سمجھئے۔ بہرحال ارواح انبیاء کرام کو بدستور اپنے ابدان کے ساتھ تعلق رہتا ہے اور مثل نور چراغ وظلمت ظرف محیط حیات و موت دونوں مجتمع ہوجاتی ہیں۔القصہ اگر ایک ضد طبعی اور ذاتی ہے اور دوسری عارضی تو پھر یہ اجتماع محال نہیں۔ بلکہ کثیر الوقوع ہے۔ورنہ کارخانہ عروض بالکل باطل ہوجائے۔ (جمال قاسمی ص ۱۲)

دوسرا شبہ

منکرین حیات کو اس مضمون رسالت مآب کے حیات علی الاتصال میں بہت شکوک پیش آتے ہیں اور ان کے شبہات نے ان کو حیات علی الاتصال کے انکار کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ ان کے اِدّعاء کے لئے ان کے پاس دلیل کوئی نہیں ہے۔ لیکن حضرت مولانا قدس سرہٗ نے اس قسم کے شبہات کے جوابات سے علماء کی جماعت کو فارغ کر دیا ہے۔ اس لئے اس شبہ کا جواب بھی حضرت مولانا کی کتاب سے نقل کرنا چاہتا ہوں:

القول الجلی کے مصنف نے مذکورہ حدیث کے معانی بدلنے کے لئے اپنے مزاج کو کچھ حرکت دی ہے مگر ناکام رہے ہیں اور اس کہنے کی کوشش کی ہے کہ حضور ﷺ کے اموال پر آپ کا ملک باقی نہیں تھا۔ مگر یہ نہ بتلا سکے کہ اس کی دلیل سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے۔ مؤلف کہتے ہیں اور اگر ملک باقی ہے تو ''ماترکناہ'' کیوں فرمایا؟ کیا یہ وہی ترک نہیں ہے جس کا ذکر ''فلھن ثلثا ماترک ولکم نصف ماترک'' آیات قرآنیہ میں آیا ہے۔ لہٰذا یہاں بعد الموت بقاء ملک کا قول کرنا عجیب اور پھر اس کی علت حیات دنیویہ نکالنا اور عجیب۔ (القول الجلی ص ۵۶)

سابق اوراق میں گزر چکا ہے کہ زرقانی ﷫، سبکی ﷫، بیہقی ﷫ نے اقرار کیا ہے کہ عروض موت کے بعد بھی حضور ﷺ کا ملک حضور ﷺ کے املاک پر قائم تھا۔ شیخ عبدالحق ﷫ لکھتا ہے: کہ امام الحرمین کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے املاک پر صدیق اکبر ﷛ حضور ﷺ کے ملک کو باقی اور قائم جانتے تھے۔ (مدارج النبوۃ ج ۱ ص ۱۷۰)

یہ حضرات علماء محدثین اور خلیفہ راشد ابوبکر صدیق ﷛ القول الجلی کے مؤلف سے کتاب وسنت کے علم اور رسالت مآب ﷺ کے امتیازات اور پیغمبرانہ خصوصیات کو بدرجہا زیادہ اور خوب جانتے تھے۔ ہمیں مؤلف کے انکار وتعجب پر افسوس ہے۔

حضرت مولانا ﷫ کہتے ہیں: مگر اور لوگ تو سب کو چھوڑ جاتے ہیں اور انبیاء کرام فقط مال کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ ازواج دینے کے قابل نہیں جو چھوڑ دیجئے بالجملہ انبیاء مال کو چھوڑ دیتے ہیں اور اموات باقی ازواج واموال دونوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ وقت مرگ ان کی مجبوری اور انبیاء کی خودمختاری جس پر ان کی رضا سے ان کا متبوض ہونا دلالت کرتا ہے۔ اس فرق پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ چھوڑ جاتے ہیں تو جانے کی ضرورت میں چھوڑنا پڑتا ہے۔ ورنہ اصل میں چھوڑنا ناگوار ہوتا ہے اور چھوڑ دینے میں دینے کے لئے باختیار خود چھوڑتے ہیں۔ سو اسی فرق کے اظہار کے لئے آپ نے یہ ارشاد فرمایا ''ماترکناہ صدقہ'' تاکہ لفظ صدقہ چھوڑ دینے پر دلالت کرے اور کسی کو چھوڑ جانے کا وہم نہ ہو جو انجام کار یہ وہم نہ ہو کہ ترک ہے تو ماترک میں آپ کا متروک بھی داخل ہوگیا۔

اس لئے یوں مناسب ہے کہ موافق ارشاد ''یوصیکم اللہ'' اس میں بھی میراث جاری ہو۔ کیونکہ چھوڑنا جو مفہوم ترک ہے۔ گو دونوں میں مشترک ہے۔ مگر وہی فرق ہے جو میں نے عرض کیا۔ اس لئے جیسے حضور نے لفظ صدقہ سے ایک قسم ترک تو متعین کر دیا۔ ایسے ہی لفظ ''للرجال نصیب وللنساء نصیب'' (النساء:۷) سے خدا نے اوروں کے حق میں قسم ثانی ترک کو متعین کر دیا علیٰ ہذا القیاس آیت ''ولیخش الذین بقرینۃ خافوا علیھم'' (النساء:۹) قسم ثانی کی تخصیص فرمادی۔ شرح اس معمہ کی یہ ہے کہ خوف اسی وقت متصور ہے۔ جب کہ بہ مجبوری چھوڑ کر جائے باختیار خود چھوڑ دیجئے تو کیا خوف ہے۔ جو چیز اوروں کو دے بیٹھتے ہیں وہ ضائع ہو یا باقی رہے اپنی بلاء سے۔ غرض جس چیز

سے خود بے تعلق ہو جائیں وہ رہ جائے یا جائے۔ اس کا کیا خوف۔ علی ہذا القیاس اموال کو باختیار خود ہم وقت مرگ چھوڑ دیا کریں تو اس صورت میں وقت مرگ بھی خداوند عالم دخل نہ دیتے۔ مگر یہ ارشاد اس بناء پر ہے کہ دل خستہ بدستور لبریز محبت ازواج و اولاد و اموال ہے۔ پھر کیونکر کہہ دیجئے کہ ہم چھوڑ دیتے ہیں، نہیں یہ چھوڑا جاتا ہے۔ سو یہ چھوڑنا اسی وقت متصور ہے کہ جسم سے اخراج روح ہو اور جس قسم کا اس کا دخول تھا جس پر یہ تمام آثار تسلط یعنی باختیار خود جسم اور اعضاء جسم کام لینا دلالت کرتا ہے۔ اس کے مناسب خروج متحقق ہو جائے۔ سو یہ بات بدلالت فرق احکام مذکورہ اور اموات میں تو ہوتی ہے پر انبیاء میں نہیں ہوتی ہے۔ یعنی بقاء اجساد کا انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ضروری ہونا اور سوا ان کے اوروں کے لئے ضروری نہ ہونا اور ازواج انبیاء کرام علیہم السلام کا نکاح ثانی کا اجازت نہ ہونا اور اوروں کی ازواج کے لئے اجازت کا ہونا اور اموال انبیاء کرام علیہم السلام میں میراث کا جاری نہ ہونا اور اوروں کے اموال میں جاری ہونا اس پر شاہد ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح کا اخراج نہیں ہوتا۔ فقط مثل نور چراغ اطراف و جوانب سے قبض کر لیتے ہیں۔ یعنی سمیٹ لیتے ہیں اور سوا ان کے اوروں کی ارواح کو خارج کر دیتے ہیں۔ (جمال قاسمی ص ۱۶)

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی مراد ظاہر ہے کہ انبیاء کے سوا دوسرے مجبوری سے چھوڑتے ہیں۔ ان کو چھوڑنے اور نہ چھوڑنے کا اختیار نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے بوقت مرگ اپنے اموال کسی کو نہیں دے سکتے۔ بلکہ حق تعالیٰ نے ان کے اموال کو ان کے وارثوں کے حق اور ملک میں دے دیا اور ان کی ارواح کا اخراج کیا گیا۔ اس لئے ان کے ملک کے حقوق باقی نہیں ہیں۔ ان کے اموال وغیرہ میں دوسروں کے حقوق اور دوسروں کا ملک ہے اور انبیاء علیہم السلام اپنے اختیار سے اپنے اموال کو جس کے لئے چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے ان کو بوقت مرگ بھی کسی کو دینے اور صدقہ کرنے کا حق ہے اور ان کی ارواح کا اخراج نہیں کیا جاتا۔ اس لئے ان کا ملک اور ان کے حقوق باقی ہیں اور حق تعالیٰ ان کے ملک اور حقوق کو دوسروں کی طرف منتقل ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور ان کے اختیار اور مرضی میں دخل نہیں دیتا۔

انبیاء علیہم السلام کو اختیار دیا جاتا ہے چاہے تو دنیا میں رہیں اور چاہے تو آخرت کا سفر کریں۔ بخاری ''باب مرض النبی و باب آخر ما تکلم بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: کوئی نبی قبض نہیں کیا جاتا ہے۔ مگر وہ اپنا مقام جنت میں دیکھتا ہے پھر اس کو اختیار ہے چاہے تو دنیا میں اور چاہے تو آخرت کا سفر اختیار کرے اور اس بیماری میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اللھم فی الرفیق الاعلی'' فرمایا تو میں نے سمجھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس رہنا پسند نہیں کرتے اور نیز میں نے جان لیا کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ نبی کو اختیار دیا جاتا ہے۔ وہ سچ تھا اور یہ اس کا وقت ہے۔ اور مسند امام احمد میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے اختیار دیا گیا میں نے لقاء رب اور جنت کو پسند کر لیا۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۱۱۲)

جب انبیاء علیہم السلام کے چھوڑ دینے اور دوسروں کے چھوڑنے میں اس قدر فرق ہے تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ماترکنا اور دوسرے لوگوں کے ماترک دونوں کیسے برابر ہو سکتے۔ یہ حضرت مولانا کے چند اقتباسات مذکورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات علی الاتصال کی بحث میں حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کے چند مختصر اقتباسات میں نے ذکر کئے ہیں کہ حضرت مولانا اپنی بحث کے ثبوت میں کتاب و سنت کی تصریحات کو ذکر کرتے ہیں اور آپ کے علم اور بصیرت میں آپ کے فکر و نظر کے تمام مباحث کتاب و سنت کی نصوص سے ماخوذ ہیں۔ مگر اخذ و استنباط حضرت مولانا کی قوت قدسیہ کی خوبی ہے۔ اگر کسی صاحب کو حضرت مولانا قدس سرہٗ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات علی الاتصال کی تحقیق حقیقت میں اختلاف ہے تو اس کی مرضی ہے۔ مگر

اس کا یہ فرض ہے کہ اپنے تکلفات کو حضرت مولانا کی فراست اور اپنے مزعومات کو حضرت مولانا کے بصائر کے مقابلہ پر دنیا کے سامنے لائے تا کہ برخود غلط خود پسندوں کے موضوعات سے دوسروں کو بھی استفادہ کرنے کا موقعہ مل جائے۔ ورنہ ارباب علم وتقویٰ کے خلاف طعن وتشنیع کی زبان کھولنا اگرچہ ان کی خوبی صرف یہی ہے۔ مگر اہل علم اس کو قبیح تر جانتے ہیں۔
کتاب وسنت کی نصوص کے وسیع دفتر میں کوئی نص ایسی نہیں ہے جس نے حضور ﷺ کی موت بمعنی ازالہ حیات کے واقع ہونے کی خبر دی ہے اور کتاب وسنت کے نصوص میں ایسا ملنا ممکن بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کی حیات طیبہ کتاب کے آنے کا عہد اور سنت میں ارشادات کا زمانہ ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں کتاب وسنت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ رسالت مآب پر موت واقع ہو چکی ہے۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو حضور ﷺ کے بعد ایسی کتاب وسنت کی جعلی اور تالیف کرنے میں کیا شبہ رہتا۔ جیسا کہ تورات کی (کتاب استثناء باب ۳۴) میں ذیل کے الفاظ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موآب کے ملک میں وفات پائی پر آج تک کسی آدمی کو اس کی خبر معلوم نہیں۔
تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا ذکر کرنا دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی یہ وہ کتاب نہیں ہے ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس کتاب میں جو آپ کی زندگی میں آپ کو دی گئی تھی۔ بیاں کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور بیت فغور کے مقابل دفن کئے گئے ہیں۔ اسی طرح انجیل میں حضرت مسیح کے صلیب کا تصور ثابت کرتا ہے کہ وہ حضرت مسیح کو اللہ کی دی ہوئی انجیل نہیں ہے جس کی تبلیغ آپ اپنی قوم میں کرتے رہے ورنہ آپ کی حیات میں آپ کی صلیب کا خاکہ حق تعالیٰ نے کیسے بیان فرمایا کہ واقعہ ہو چکا ہے۔ اسی طرح قرآن وحدیث میں حضور ﷺ کی موت واقع ہو چکنے کو بتلانا کسی عقل خوردہ کا کام ہوسکتا ہے ورنہ اہل علم اس کو باور نہیں کر سکتے کہ حضور ﷺ نے اپنی حیات میں خبر دی ہے کہ حضور ﷺ وفات پا چکے ہیں اور اسی طرح کتاب نے حضور ﷺ کی زندگی میں بتلا دیا ہے کہ حضور ﷺ کی موت واقع آ چکی ہے۔ قرآن شریف حضور ﷺ کی موت کے واقع ہو چکنے کی خبر ہرگز نہیں دیتا۔ البتہ قرآن میں حضور ﷺ کو آئندہ موت کے عارض ہونے کی پیش گوئی ہے۔ لیکن کتاب وسنت میں ہم کسی ایسی نص کو نہیں جانتے کہ حضور ﷺ کی موت حضور ﷺ کی سابق حیات کو ضرور زائل کرے گی یا جزاء وسزا کے دن تک حضور ﷺ کے مقدس جسم اور پاکیزہ روح میں بالکلیہ مفارقت رہے گی اور کہا جا سکتا ہے کہ کتاب وسنت میں اس معنی کے بیان کرنے کے لئے کوئی عبارت نہیں ہے۔ بلکہ کتاب وسنت میں نوم پر موت کا اطلاق کیا گیا اور ایسی اشیاء پر بھی کتاب میں موت کا اطلاق مذکور ہے جن میں سرے سے حیات نہیں تھی۔ جیسے کہ مذکور ہو چکا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ موت سے پہلے حیات لازم نہیں اور موت کے وقت حیات کا ازالہ ضروری نہیں ہے۔
اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کتاب وسنت کی زبان میں حضور ﷺ کو موت کے عارض ہونے کے وقت بھی حضور ﷺ کی حیات کا انقطاع لازم نہیں ہے۔ بلکہ کتاب وسنت میں کوئی ایسی نص نہیں ہے کہ خلاصہ کائنات، باعث تکوین عالم، امام الانبیاء، محبوب رب العزت کو عروض موت کے وقت آپ کی اصلی اور ذاتی اضافی حیات کے قیام اور بقاء کا انکار کرتی ہے۔ حضور ﷺ کی فوق العادت موت کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انکار کے جواب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا سب سے پہلا اور اہم خطبہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے اور منکرین حیات اس سے حضور ﷺ کی موت بمعنی ازالہ حیات پر اور نیز آرام گاہ میں نعوذ باللہ حضور ﷺ کے مقدس جسم کے بے جان پڑے رہنے پر بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس لئے میں اس اہم اور مبینہ خطبہ کو یہاں ضروری تفصیل کے ساتھ نقل کرنا چاہتا ہوں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جوابی خطبہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹے ابوسلمہ کو بتایا کہ میرے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر مدینہ کے عوالی سنح سے گھوڑے پر آئے۔ مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور کسی سے بات چیت نہیں کی۔ سیدھے میرے حجرے میں حضور ﷺ کے دیکھنے کے ارادہ سے چلے آئے اور حضور ﷺ پر یمن کے کپڑوں میں سے کپڑا پڑا ہوا تھا۔ آپ نے پہلے وہ کپڑا اٹھایا پھر اوپر گر پڑے۔ پس بوسہ دیا اور رونے لگے۔ پھر فرمایا میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں۔ اللہ کی قسم آپ پر دو موتوں کو اللہ جمع نہیں کرے گا (آپ دو دفعہ وفات نہ پائیں گے) لیکن جو موت آپ کے لئے اللہ نے لکھ دی تھی وہ آپ کو پیش آ گئی۔ یہی ابوسلمہ کہتے ہیں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نکلے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ (مسجد میں) لوگوں سے بول رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا بیٹھ جایئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیٹھ جانے سے انکار کیا۔ لوگ (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات سن رہے تھے) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اما بعد! جو بھی تم میں سے حضور ﷺ کی عبادت کرتا تھا "فان محمدا قد مات" بیشک حضور ﷺ فوت ہو گئے اور تم میں سے جو اللہ کی عبادت کرتا تو اللہ زندہ ہے نہیں مریں گے اور فرمایا "وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم" (آل عمران: ۱۴۴) ترجمہ: (اور محمد تو ایک رسول ہے ہو چکے اس سے پہلے بہت رسول پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سے پہلے گویا کسی کو اس آیت کے نازل ہونے کی خبر بھی نہ تھی تو سب لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کو لیا۔ پس جس کو سنتے تھے اس آیت کو پڑھتے تھے۔ حضرت سعید بن المسیب کہتے ہیں اس آیت کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کو پڑھتے میں نے سنا۔ پس میں مارا گیا اور میرے پاؤں مجھے نہ اٹھا سکے اور میں زمین پر گر پڑا۔ جب میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تلاوت کو سنا اور یہ سمجھ لیا کہ حضور ﷺ تشریف لے گئے ہیں۔ (بخاری ج دوم ص ۶۴۰ باب مرض النبی ووفاتہ)

اور بخاری باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ میں عروہ بن الزبیر عن عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح مذکور ہے: کہ حضور ﷺ کی وفات ہوگئی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سنح میں تھے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور فرمایا اللہ کی قسم! حضور ﷺ فوت نہیں ہوئے اور کہا اس کے سوا حضور ﷺ کی عدم موت کے سوا اور کوئی بات آتی نہ تھی اور کہ اللہ آپ کو اٹھائے گا اور آپ ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے، جنہوں نے کہا کہ حضور ﷺ فوت ہو گئے۔ پس ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور مذکورہ خطبہ فرمایا اور جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی وفات کے واقع ہونے کی خبر دے دی تو لوگ بے اختیار رونے لگے۔

اور قاسم بن محمد بن ابی بکر فرماتے ہیں کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: حضور ﷺ کی آنکھیں اوپر کو اٹھ گئیں اور فرمایا ملاء اعلیٰ کو چاہتا ہوں اور پوری حدیث بیان کی (اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بیان کیا کہ حضور ﷺ نے وفات نہیں پائی اور ہرگز وفات نہیں پائیں گے، یہاں تک کہ منافقوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹیں گے۔ عمدۃ القاری، فتح الباری میں اس حدیث کی شرح میں اس طرح نقل کیا ہے اور دونوں حضرات نے لکھا ہے کہ بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو معلقاً ذکر کیا ہے۔ مگر طبرانی نے موصول اور مسند روایت کیا ہے)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں کے خطبوں سے اللہ نے نفع پہنچایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نفاق سے ڈرایا، ان میں نفاق تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائی اور جوان پر لازم اور حق تھا ان کو معلوم کردیا اور لوگ آیت ''وما محمد الا رسول الخ'' کی تلاوت کرتے ہوئے باہر نکلے۔ (بخاری ابواب المناقب ص ۵۱۷)

ان حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوئی ہے تو عین اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہیں تھے کچھ وقفہ کے بعد تشریف لائے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بول رہے تھے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بولنے سے منع فرمایا اور بیٹھنے کو کہا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاموش ہوجانے اور بیٹھ جانے سے انکار کیا۔ کتاب الجنائز میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انکار مذکور ہے اور عبدالرحمن بن عوف ابوسلمہ کی روایت سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو اللہ نے موت لکھ دی تھی وہ آپ کو پیش آگئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے مقابلہ پر خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے خاص قسم کی موت مقدر فرمائی تھی۔ جو ''انک میت و انہم میتون'' میں مذکور ہے۔

اور نیز اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طویل سکوت اور تعطل شعور کو جانتے تھے۔ مگر ظاہر کے تعطل کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ موت کی حقیقت نہیں جانتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عروض موت کا انکار نہیں کرتے تھے۔ مگر انہیں خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو موت ضرور آئے گی۔ مگر اس وقت آئے گی کہ جب ان منافقوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے حق تعالیٰ ختم کردے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی خبر پھیلاتے ہیں اور اب منافقین موجود ہیں اور نیز خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی یہ خبر منافقین نے اڑائی ہے اور شہرت دے رہے ہیں۔ جیسے کہ احد کے دن بھی منافقین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر اڑادی تھی۔ مگر سب جانتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے ہوچکنے کی خبر میں احد کے دن کی طرح موت کی خبر اڑانے میں اشتباہ ہورہا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان ذکر کرتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑا اوڑھایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ نے مجھ سے اندر آنے کی اجازت چاہی اور تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نگاہ ڈالی اور فرمایا ''واغشیتاہ'' وائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غشی۔ پھر دونوں چلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا تم نے جھوٹ بولا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوں گے جب تک منافقوں کو فنا نہ کریں اور حضرت عباس کو جواب دیتے ہوئے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عروض موت کو منافقوں سے جنگ وغیرہ امور کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیان فرمایا۔

اور ابن ابی شیبہ ذکر کرتے ہیں ابن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گزر رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہہ رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے ہیں اور آپ کو اس وقت موت عارض ہوگی کہ منافقوں کو قتل کریں گے اور لوگ یہ سن کر خوش ہورہے تھے اور اوپر کو سر اٹھاتے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ یہ بھی کہتے ہیں کہ منافقین یہ سن کر مر رہے تھے یہ بھی کہتے ہیں، ہمارے چہروں پر پردہ تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ نے اس کو ہٹادیا اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس خیال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اتفاق تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی وفات نہیں پائی ہے۔ لیکن ان کی اکثریت کے باوجود ان کا اجتہاد خطا کار تھا اور یہ ہوسکتا ہے کہ اقلیت کا اجتہاد صواب دید ہو جیسے کہ یہاں ہوا۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۱۱۹ باب وفات النبی ومرضہ)

امام احمد اور ابن ابی شیبہ کی مذکورہ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت کے بعد کپڑے اوڑھے دیکھا تھا جب آپ کو حضور ﷺ کی موت کی خبر پہنچ چکی تھی اور فرمایا یہ غشی ہے موت نہیں ہے اور اس کہنے میں ابن عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے اور دوسرے اکثر صحابہ کو یہ خیال ہو رہا تھا اور حضور ﷺ کی طویل خاموشی اور غیر معمولی حواس ظاہرہ کے تعطل کو سب جانتے تھے۔ مگر اس جاننے کے باوجود بھی اس طویل تعطل کو موت نہیں کہا بلکہ غشی کہا۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں موت کی حقیقت کچھ اس سے زائد تھی اور حضور ﷺ کی موت کا ان کو یقین تھا مگر کسی دوسرے وقت پر اس کو ملتوی سمجھتے تھے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے جوابی خطبہ میں یہ سمجھا دیا کہ اس طرح ظاہر کا تعطل موت کی حقیقت ہے اور اسی حجاب نے ان کے چہروں کو ڈھانپا تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے۔ مگر سوچا سمجھا نہیں تھا اور اس حجاب کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اٹھا دیا۔

اس لئے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں اس سے زائد اور کوئی چیز مذکور نہیں ہے کہ قرآن شریف کی آیات میں حضور ﷺ کو موت کے عارض ہونے کا امکان اور موت کے آنے کی خبر ہے اور اس طرح کے تعطل کی بنیاد پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی موت کے واقع ہونے کا اظہار فرمایا اور جس خیال کی بنا پر اس وقت کے تعطل کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی موت واقع ہونے کا انکار فرماتے تھے۔ آل عمران کی آیت میں اس کا رد مذکور ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کو بیان فرمایا۔ مگر اس میں بھی تعطل کے سوا کسی زائد چیز کو موت کہنے کا بیان نہیں ہے۔ آگے اس کی تفصیل کروں گا۔

محب طبری رحمہ اللہ ذکر کرتے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور ﷺ میرے سینے سے تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ دفعۃً میری طرف ایسی نظر سے دیکھا جیسے کہ گھر والوں سے کوئی چیز مانگتے وقت نگاہ کی جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے میری طرف دیکھا اور میرے سینہ سے ایک طرف کو مائل ہو گئے۔ مجھے خیال ہوا کہ حضور ﷺ کو غشی ہو گئی اور میں نے کپڑا اوڑھایا۔ اتنے میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور مجھ سے پوچھا بیٹی حضور ﷺ کا کیا حال ہے۔ میں نے حال بیان کرتے ہوئے کہا میں نہیں جانتی کہ غشی ہے یا قبض کئے گئے ہیں اور فرماتی ہیں کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے دونوں نورانی آنکھوں کے درمیان اپنا منہ رکھا اور اپنے دونوں ہاتوں کو حضور ﷺ کے صدغین دونوں آنکھوں اور کانوں کے درمیان رکھا اور فرمایا: ”وانبیاہ واخلیلاہ الخ“ (ج اول ص ۹۸)

اور فرماتی ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ صدیق تشریف لائے اور حضور ﷺ کے چہرہ سے کپڑا اٹھایا اور حضور ﷺ کے مقدس منہ پر اپنا منہ رکھا اور حضور ﷺ کی خوشبو سونگی۔ پھر آپ نے کپڑا اوڑھایا اور ہماری طرف توجہ فرمائی اور مذکورہ خطبہ پڑھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا حضور ﷺ فوت ہو گئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں!

(الریاض النضرۃ لمحب الطبری ج اول ص ۹۶)

غرض یہ کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی حضور ﷺ کی اس حالت کے متعلق خیال تھا کہ وہ غشی ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ سے جب سنا کہ یہ غشی ہے یا قبض ہے تو آپ نے اس تجسس اور تحقیق کی طرف پوری توجہ کی اور جس قدر غشی اور قبض کے سمجھنے کے لئے آپ کے امکان میں تھا اس قدر پوری توجہ سے غور اور تحقیق کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ غشی نہیں ہے بلکہ قبض ہے۔ موت کے قرائن اور علامات کے ٹٹولنے کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جتلایا کہ حضور ﷺ نے وفات پائی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آنے سے پیشتر حضور ﷺ کو کپڑا اوڑھے

پڑے دیکھا تھا۔ مگر رسالت مآب فداہ ابی وامی ﷺ کے خیال مفارقت کے حزن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حال غالب آیا اور غلبہ حال میں غشی اور قبض میں فرق کرنے والے قرائن اور نشانات کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور مفارقت نبوت ناقابل برداشت صدمہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بعض جزئی خصائص کی بناء پر لاحق ہوسکتا تھا ایسا نہ تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ ہوش وحواس اور دانشمندانہ حوصلہ پر قائم رہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلبہ حال سے مجبور ہونے پر تعجب نہ کیا جائے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: واز انجملہ آنست کہ فاروق درموت آنحضرت شک کردہ باید دانست کہ قصہ دلالت میکند برآنکہ فاروق میدانست کہ موت برآنحضرت شدنی است پس مخالف آیہ ''انک میت وانھم میتون'' اعتقاد نہ کردہ بود۔ لیکن گمان میکرد کہ آنچہ واقعہ شدہ است موت نیست بلکہ تعطیل حواس ظاہر است بسبب انتقال بامر باطن۔ چنانکہ دراثناء وحی واقع میشد وشک درآنکہ ایں واقع موت است یا غشی مصادم، ہیچ نص نبود بلکہ راجع بغلت تتبع قرائن است بسبب اشتغال قلب بحزن ومعنی قول رد کانی لم اسمعہا اینست کہ استماع ایں آیت مائل گردانید اورا بہ تتبع قرائن وپیش ازیں میلان باں نداشت۔'' (قرۃ العینین ص ۲۷۰)

حضرت شاہ صاحب حیات وموت کی کسی قسم کی بحث میں یہ نہیں لکھتے بلکہ ایک سوال ہے۔ اس کے جواب میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے دفاع کرتے ہیں اور غرض یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اس موجودہ حال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شک تھا کہ وہ غشی ہے یا موت اور اس حال کے غشی یا موت کے متعلق کوئی نص نہیں تھا کہ اس حال میں غشی یا موت میں شک اس نص کے مزاحم ہوا ہے۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ خیال کرتے تھے کہ جیسے وحی کے حال میں انتقال بامر باطن کی وجہ سے حواس ظاہرہ معطل ہوجاتے تھے۔ اسی طرح اس حال میں ابھی امر باطن کے انتقال نے حضور ﷺ کے ظاہر اور ظاہری حواس کو معطل کردیا ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اگر موت کے قرائن کو ٹٹولتے اور سوچتے جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غور کیا تھا تو آپ کو غشی اور موت میں فرق معلوم ہوجاتا اور شک میں نہ پڑتے۔ لیکن حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا قلب حزن کی گہرائیوں میں پڑ چکا تھا۔ اس لئے موت کے قرائن کی تلاش اور کوشش کی طرف توجہ نہیں کی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں آیت مذکورہ نے آپ کو اس طرف متوجہ کردیا۔ اس حال سے پہلے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو ظاہر کے تعطل کے حال میں دیکھا تھا اور اس سے یہاں بھی اشتباہ ہوگیا۔

بخاری اور مسلم نے کتاب الحج میں صفوان بن یعلیٰ کے طریقہ سے روایت کیا ہے کہ یعلیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے حضور ﷺ اس حالت میں دکھادیجئے کہ آپ پر وحی نازل ہورہی ہو۔ حضور ﷺ کا قیام جعرانہ میں تھا کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول کیا ارشاد ہے۔ جس نے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور وہ خوشبو سے تر ہو۔ حضور ﷺ نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر آپ پر وحی آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یعلیٰ کی طرف اشارہ کیا۔ یعلیٰ آئے اور حضور ﷺ کے اوپر ایک کپڑا تنا ہوا تھا جس سے آپ پر سایہ کیا گیا تھا۔ یعلیٰ نے اپنا سر اس کپڑے کے اندر ڈالا کیا دیکھا کہ رسول خدا ﷺ کا مبارک چہرہ سرخ ہے اور آپ لمبی لمبی سانس لے رہے ہیں۔ پھر وہ حالت آپ سے زائل ہوگئی۔ آہ

وحی کی حالت میں آلات جسدانیہ بالکل معطل ہوجاتے تھے اور صرف روحی قوتوں اور قلبی حواس سے کام لینا ہوتا تھا دل کے کانوں سے وحی کی آواز سنتے تھے اور دل کی الٰہی قوتوں سے علوم کی تلقی کرتے تھے اور محفوظ کرتے تھے۔ اس لئے اس حالت میں وحی کی سی حالت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غشی اور موت میں اشتباہ ہوجانا کچھ تعجب کی بات

نہیں اور خصوصاً جب والہانہ وارفتگی اور غلبہ حال کا تاثر ہے۔ آپ نے پڑھ لیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کو فرمایا۔ مگر آپ نے خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے سے انکار فرمایا۔ کیا عمر رضی اللہ عنہ اپنے مزاج میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کی تعمیل میں تامل اور انکار کرتے ہیں۔ یہ غلبہ حال نہیں تو اور کیا ہے۔

بخاری رحمہ اللہ باب حملی من الزنا میں ذکر کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایک بات میں نے سوچ رکھی تھی جو مجھ کو بہت ہی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے بولنا چاہا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے خاموش ہونے کو کہا۔ میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ناراض کرنا مناسب نہ سمجھا میں خاموش ہو گیا۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو کی۔ (بخاری)

عمر رضی اللہ عنہ کا اصل مزاج یہ ہے جب کہ اپنے حال پر ہے اور صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیا جناب فاطمۃ الزہراء کو دیکھئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ حضرت فاطمۃ الزہراء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد روتی اور کہتی تھی۔ ہائے میرے ابا تو نے اپنے رب کے بلانے پر لبیک کہا۔ ہائے میرے ابا ہم جبرائیل کو آپ کی وفات کی خبر سناتے ہیں اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دفنائے گئے تو حضرت فاطمۃ الزہراء نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کیا تم لوگوں کو یہ برداشت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی پر مٹی ڈالو۔ حال کا غلبہ ہے اور بے بسی بے اختیاری مجبوری کی باتیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کسی قسم کی ادنیٰ سرزنش بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں کی ہے۔ بلکہ معذور فرمایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس وقت کے خطبہ کو بھی نفع بخش بتلایا ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ کا اہم حصہ

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ میں ابتدائی حصہ یہ مذکور ہے اس اللہ کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتوں کو کبھی جمع نہ کرے گا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی شرح میں مختلف باتیں کہی گئیں ہیں۔ ہمیں ان کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس پر غور کرنے کے لئے اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خیال کی تردید کے لئے کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودہ حالت موت نہیں ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ خطبہ فرما رہے ہیں اور جس حقیقت واقعی کو آپ ظاہر فرمانا چاہتے ہیں وہ اس قدر ہے کہ اس وقت کی حالت موت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک موت اور دو موت کا سوال اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے نہیں تھا۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک موت کا انکار اور دو موتوں کا اعتراف نہیں تھا اور نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیال کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو موتیں جمع نہیں ہو سکتی تھیں۔

جس حالت کی تشخیص کے لئے یہ خطبہ دیا گیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ امام احمد کی مذکورہ روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو غشی فرمایا ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک اور حکم کا اضافہ کرنا چاہا اور کسی سوال اور کسی کے رد کے خیال کئے بغیر یہ بتانا چاہا ہے کہ اس دنیا کی اس موت کے بعد دوسرے عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حال دوسرے اموات کی طرح نہیں ہے کہ ان کی طرح قبر میں حضور کو بھی دوسری بار موت آئے گی۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت یہی ایک موت ہے جو تمہارے سامنے ہے۔ عام اموات کی طرح دوسری موت آپ کے لئے ہرگز نہیں ہے اور اس موت کے بعد دوسرے عالم میں آپ کی حیات دائمی اور مستمر ہے اور اس لئے بخاری کے کتاب المغازی باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور کتاب الجنائز میں آپ کا یہ ارشاد اس فرمانے کے بعد متصل مذکور ہے۔ جو موت آپ کے لئے لکھی گئی تھی وہ آپ کو پیش آ چکی۔

چنانچہ علامہ عینی کہتے ہیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں دو موتوں سے مراد، ایک دنیا کی موت اور دوسری قبر کی موت ہے اور یہ دو موتیں اہل اسلام میں اور اسلامی علوم میں معروف اور مشہور ہیں۔ اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارشاد میں معرفہ ذکر کیا گیا۔ یہ دو موتیں دنیا کی موت اور قبر کی موت انبیاء علیہم السلام کے سوا ہر انسان کو پیش آتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو ان کی قبروں میں موت پیش نہیں آئے گی بلکہ وہ زندہ رہتے ہیں اور عام لوگ زندہ کئے جانے کے بعد اور فرشتہ کے سوال و جواب کے بعد پھر مرتے ہیں۔ پھر قیامت کے دن زندہ کئے جائیں گے۔ اہل السنۃ والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ سب لوگوں کے لئے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ قبر میں حیات اور موت دونوں ہیں۔ البتہ معتزلہ اور ان کی قسم کے دوسرے لوگ قبر میں حیات کا انکار کرتے ہیں۔ (عمدۃ القاری باب فضل ابی بکر ج ۱۶ ص ۱۸۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہل السنۃ والجماعت قبر میں حیات کے قائل ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کی طرف سے قبر میں منکرین حیات کو بہتر جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی دائمی اور ہمیشہ کی زندگی ہے جس کے بعد موت نہیں ہے اور انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارشاد میں ''الموتتین'' معرف باللام ذکر کیا گیا کہ یہ دونوں موتیں ایک دنیا کی اور دوسری قبر کی انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہر ایک کے لئے معروف اور مشہور ہیں کہ وارد ہوں گی۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۱)

ان حضرات محدثین نے جو اہل اسلام اور ارباب علم میں معروف اور باتامل مقبول ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں مذکورہ ارشاد۔ کے یہ معنی مراد متعین کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دنیا میں موت آنی تھی وہ آچکی اور آئندہ برزخ میں آپ ہمیشہ اور متصل حیات میں زندہ ہیں اور ان حضرات نے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ اہل سنت والجماعۃ کا مسلک بھی یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں دائمی حیات میں زندہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ منکرین حیات کے خلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی حیات کا اعلان کرتا ہے اور اس خطبہ سے ہرگز ہرگز منکرین حیات کے اس نظریہ کی تصدیق یا تائید نہیں ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں بے جان مردہ پڑے ہیں یا آپ کی روح کو آپ کے جسد سے اس قدر تعلق ہے جیسا کہ عام اموات کے اجسام کے ساتھ ان کے ارواح کو نعیم یا عذاب کے لئے تعلق ہوتا ہے جیسا کہ پہلے اوراق میں بالتفصیل یہ بیان مذکور ہوا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسالت مآب کے حقیقی حیات کے انکار کرنے والے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ خطبہ بے جا اور غلط مطلب کے لئے استعمال کرتے اور پڑھ کر سناتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آرامگاہ نبوت میں جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی حیات کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ بقول ان حضرات حفاظ حدیث اہل السنۃ والجماعت کے مسلک سے الگ معتزلہ سے رشتہ ناتا جوڑ رہے ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے استدلال کا مفہوم

بخاری رحمہ اللہ کتاب المغازی اور کتاب الجنائز میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں سورۃ آل عمران کی آیت ''وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم'' (آل عمران: ۱۴۴) سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر و انکار کے جواب میں استدلال کرنا مذکور ہے۔ اگرچہ اس آیت کے ساتھ دوسری آیت ''انک میت وانھم میتون'' کو بھی بخاری رحمہ اللہ نے کتاب المناقب میں ذکر کیا ہے۔ مگر اس کا انکار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں تھا اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقریر و انکار کی اس سے تردید ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس آیت میں صرف

موت کے آنے کی خبر ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا اعتراف کرتے تھے۔ البتہ سورۃ آل عمران کی آیت میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا استدلال اور انکار کا رد پورا ہوتا ہے۔ میں آگے اس کو واضح کروں گا۔

اس وقت سورۃ آل عمران کی آیت پر غور کیجئے کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سورۃ آل عمران کی آیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے واقع ہو چکنے پر استدلال نہیں کیا ہے اور نہ کسی دوسرے صحابی نے اس آیت سے یہ سمجھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت واقع ہو چکی ہے اور نہ آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اس کے نزول کے وقت یا اس کے نزول سے پیشتر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت ہو گئی تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کے موجودہ حالت سے جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تقریر فرما رہے تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خطبہ دینے کی ضرورت پڑی۔ سات سال پیشتر یہ آیت نازل ہو چکی تھی۔ اگر آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے واقع ہو چکنے کی خبر دیتی تھی تو اس صورت حال سے سات سال پیشتر یہ سمجھ لیا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی ہے اور یہ سراسر خلاف واقع ہے اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ہرگز اس کا انکار نہ فرماتے۔

اس آیت کے معنی صرف اس قدر ہے کہ نزول آیت کے وقت پیغمبرانہ دعوت کو قبول کرنے والے موجودہ حضرات صحابہ کو جو اس آیت کے اوّلین مخاطب تھے یہ ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسالت مآب سے پہلے بہت رسول ہو چکے ہیں۔ اپنی قوموں متبعین کو چھوڑ کر گزر گئے، چلے گئے ہیں۔ مگر ان کا دیا ہوا دین باقی رہا اور ان کے متبعین اس پر قائم رہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا جائیں یا مارے جائیں جیسے کہ احد کے دن یہ خبر مشہور کی گئی تھی تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ تمہیں ایسا نہ کرنا چاہئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس وقت کے موجودہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے الٹے پاؤں پھر جانے پر اس آیت میں انکار اور تغلیظ و زجر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر استقامت کی ترغیب اور تائید ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خداداد فہم و بصیرت کی امتیازی حسن و فضیلت ہے کہ اس آیت میں قرآن شریف کے معجزانہ شان کا یہ بلیغ اشارہ سمجھا رہے ہیں کہ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دین پر ثبات و استقامت کے لئے کہا گیا ہے اور دین سے الٹے پاؤں پھر جانے پر تغلیظ و انکار کیا گیا وہ حضرات صحابہ ہیں۔ جنہوں نے دین نبوی کو قبول کیا تھا۔ ان کی زندگی میں ان کی موجودگی میں یہ ہو سکتا ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی موت واقعہ ہو جائے یا آپ شہید کئے جائیں۔ اگر اس آیت کے اوّلین مخاطب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی حیات اور موجودگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی ہے تو وہ اس آیت کے بیان کا مقصد اور منشاء ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ آیت کے اوّلین مخاطب زندہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا انکار کرنا اور اپنی زندگی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے انکار کے لئے عذر بنانا اس آیت کے مفہوم اور معنی کے خلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی وفات سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکنے کے متعلق جو خلجان تھا جس کو میں عنقریب ذکر کروں گا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کی اس موقعہ پر تلاوت کی اور اس اجتماع میں اعلان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت واقع ہو چکی ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس آیت کے مفہوم سے خلجان رفع ہو گیا اور حقیقت حال کا یقین ہوا اور اس یقین سے اس قدر آپ کو صدمہ پہنچا کہ کھڑے نہ رہ سکے اور زمین پر گر پڑے۔

سید آلوسی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس آیت سے غفلت ہو گئی تھی اور فرمایا تھا کہ منافقین یہ گمان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔ اللہ کی قسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس گئے تھے

اور چالیس رات الگ رہے اور پھر واپس آ گئے۔ اسی طرح حضور ﷺ ضرور واپس آئیں گے اور ان منافقوں کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے جنہوں نے خیال کیا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات ہو گئی ہے۔ (روح المعانی ج ۴ ص ۶۶)

میں سمجھتا ہوں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ میں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں۔ جس سے منکرین حیات نبوت کے اس فکر و اعتقاد کی تائید ہو سکتی ہے کہ آرام گاہ نبوت میں نعوذ باللہ حضور ﷺ کا مقدس جسد بے جان مردہ پڑا ہے یا حضور ﷺ کے جسد سے حضور ﷺ کی روح کو صرف اس قدر تعلق ہے جتنا کہ عام اموات کے اجسام کے ساتھ ان کی روح کو نعیم و عذاب وغیرہ کے لئے ہوتا ہے۔ جس کو یہ صاحبان برزخی اور روحانی حیات کہتے ہیں ہیں۔ بلکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں یہ ارشاد صدیقی کہ عام اموات کی طرح قبر میں پہلی موت کے بعد دوسری موت کے آنے سے اللہ تعالیٰ آپ پر اس پہلی اور موجودہ موت کے بعد قبر میں دوسری موت کے آنے میں دو موتوں کو جمع نہیں کرے گا۔ اہل السنۃ والجماعت اور معتقدین حیات نبوی کی اس مسلک کی تصدیق و تصویب کرتا ہے کہ حضور ﷺ رسالت مآب کی صرف حیات کا نہیں بلکہ حیات سے زائد افعال حیات نماز، حج، تلاوت وغیرہ اور ان کی زیارت کے وقت ان سے شفاعت کی درخواست کرنے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

انبیاء کا قبروں میں مرزوق ہونا، نماز پڑھنا اور حج کے لئے قبروں سے نکل کر جانا صحیح حدیثوں میں مذکور ہے اور زیارت کے وقت انبیاء سے سلام کا جواب سننا، استغاثہ اور شفاعت کی درخواست کرنا، امت مسلمہ کے معروف اور مقبول محدثین اور فقہاء نے لکھا ہے۔

ابراہیم بن بشار فرماتے ہیں: میں حج کرنے کے بعد مدینہ منورہ آیا اور آرام گاہ نبوت پر حاضر ہو کر حضور ﷺ کو سلام کہا۔ میں نے حجرہ کے اندر سے سنا وعلیک السلام اس طرح اولیاء و صلحاء کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے۔ (وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۳۵۳)

محمد بن المنکدر فرماتے ہیں: میرے باپ کو کسی آدمی نے اسی دینار امانت دیئے اور ضرورت کے وقت اس نے خرچ کرنے کی اجازت دی تھی۔ میرے والد نے اس کو کہا کل آیئے اور میرے والد آرام گاہ سے مسجد میں تمام رات بار بار استغاثہ کرتے تھے۔ اسی حال اندھیرے میں ایک صاحب نے مجھ سے کہا ہاتھ بڑھاؤ۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور ایک تھیلی مجھے دی گئی جس میں اسی اشرفیاں تھیں۔

امام ابو بکر بن المقری فرماتے ہیں کہ میں اور طبرانی اور ابو الشیخ حرم مدینہ میں کئی دن سے بھوکے تھے۔ عشاء کے وقت میں آرام گاہ نبوت پر حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ بھوک ہے اور ابو القاسم نے کہا بیٹھ جاؤ یا رزق ہے یا موت ہے۔ طبرانی بیٹھے رہے اور میں اور ابو الشیخ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک علوی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اس نے ہمیں بہت کچھ کھانے کو دیا اور جب ہم کھا کر فارغ ہوئے تو اس علوی نے ہم سے کہا حضرات! آپ نے حضور ﷺ سے شکایت کی۔ مجھے حضور ﷺ نے تمہیں کھلانے کا حکم دیا۔

ابو عبداللہ فرماتے ہیں: میں ابھی بالغ نہیں تھا اور اپنے والد کے ساتھ مکہ کے بعد مدینۃ الرسول گیا۔ میں نے اپنے والد سے بار بار کہا میں بھوکا ہوں میرے والد نے حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میں رات کو آپ کا مہمان ہوں اور مراقبہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا، کبھی روتے تھے اور کبھی ہنستے تھے اور بتایا حضور ﷺ نے

میرے ہاتھ میں روپے دے دیئے ہیں اور اپنا ہاتھ کھولا اس میں روپے پڑے ہوئے تھے۔ ہم اس سے خرچ کرتے تھے یہاں تک کہ ہم شیراز پہنچ گئے۔ (وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۳۸۰)

ابی القاسم الصقلی فرماتے ہیں: مجھے ایک ثقہ صاحب نے فرمایا کہ ہم پانچ ماہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے۔ میں نے کہا یا سید الاولین والآخرین ہم بھوکے ہیں اور ضعیف ہیں۔ واپس جانے سے مجبور ہیں۔ ایک صاحب حجرہ مطہرہ میں داخل ہوئے اور کچھ باتیں ان سے کہیں اور کہا یا جداہ یا جداہ پھر نکل کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور کھلایا اور فرمایا آئندہ میرے دادا کو اپنی تکلیف کی شکایت مت کیجیو۔ میرے جد کو تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں کھانا پہنچ جایا کرے گا اور نوکر کو ساتھ کر دیا کہ پاکیزہ حجرہ تک پہنچا دو۔ میں نے راستہ میں سے اس کو واپس کرنا چاہا۔ اس نے انکار کیا اور کہا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ حضور ﷺ میرے آقا کو یہ بتلا دیں گے۔ (وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۳۸۴)

حافظ محمد بن موسیٰ حافظ ابا سعید سمعانی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات میں ذکر کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ کے دفنانے کے تین دن بعد ایک اعرابی آیا اور آرام گاہ نبوت پر گر پڑا اور کہا جو آپ نے کہا تھا اس کو ہم نے سنا اور اپنے اللہ سے محفوظ کیا اور ہم نے جو آپ سے یاد رکھا ہے اور آپ پر اترا ہے اس میں یہ ہے ''ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جآؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول'' (النساء: ۶۴) میں نے ظلم کیا اور تیرے پاس آیا ہوں میری شفاعت کیجئے۔ آرام گاہ نبوت سے آواز آئی تو بخشا گیا۔

ائمہ کی ایک جماعت نے حضرت عتبی سے ایک اعرابی کی معروف ومشہور حکایت نقل کی ہے۔ ابن عساکر اور ابن الجوزی بھی روایت کرتے ہیں۔ محمد بن حرب ہلالی فرماتے ہیں: میں مدینہ منورہ میں آرام گاہ نبوت کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور کہا یا خیر الرسل اللہ نے تجھ پر سچی کتاب اتاری ہے۔ اس میں ارشاد ہے ''ولو انھم اذ ظلموا انفسھم الخ'' میں تیرے پاس آیا ہوں۔ رب سے معافی چاہتا ہوں اور تیری شفاعت چاہتا ہوں۔ پھر وہ چلا گیا۔ میں سو یا میں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا اور ارشاد فرمایا اس آدمی سے ملو اور کہو کہ اللہ نے اس کو میری شفاعت سے معاف کر دیا ہے۔ (وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۳۶۱، تفسیر ابن کثیر)

شیخ ابن ہمام نے کتاب الحج کے آخر میں حضور ﷺ کی زیارت پر بہت مفصل بیان کیا ہے اور آرام گاہ نبوت کے سامنے امور مذکورہ کے علاوہ یہ بھی عرض کیا جائے یا رسول اللہ! میں شفاعت کے لئے سوال کرتا ہوں۔ یہ مذکورہ واقعات اور اس قسم کے بے شمار واقعات برزخ میں اس ذات پاک کی حیات طیبہ کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ جس کی حیات دنیا کی حقیقی حیات کے ہمرنگ ہے۔ اس لئے کہ انبیاء کا قبروں میں مرزوق ہونا۔ نماز پڑھنا اور حج کرنا، تلاوت کرنا۔

مذکورہ واقعات اصل حیات نہیں ہے بلکہ ان سے اصل حیات سے زائد افعال اور اعمال حیات کا ثبوت ہوتا ہے اور برزخی روحانی زندگی میں میت میت ہے۔ افعال عباد کی دنیا میں مردہ کا کوئی فعل نہیں ہے اور انبیاء کے یہ مذکورہ افعال ان کے جسد اور جسمانی حیات کے ایسے دلائل اور آثار ہیں جن سے انبیاء کی حیات کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے کہ حضور ﷺ قبر میں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ حضور ﷺ سے استغاثہ کیا جاتا ہے اور آپ تدارک فرماتے ہیں۔ آپ سے مانگا جاتا ہے۔ آپ عنایت فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ سے شکایت کی جاتی ہے۔ آپ اس پر غور فرماتے اور تدبیر فرماتے ہیں۔ آپ سے شفاعت کی درخواست کی جاتی ہے۔ آپ قبول فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع دیتے ہیں۔ یہ دنیاوی اور حقیقی حیات نہیں ہے تو وہ دنیاوی اور حقیقی حیات اور کیسی ہوتی ہے۔

وفات کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی وفات کا انکار کیوں کیا تھا

خیال ہوسکتا ہے کہ غلبہ حال سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معذوری سے حضور ﷺ کی وفات کے دن حضور ﷺ کی وفات کا انکار کیا تھا۔ لیکن یہ بھی خیال ہوسکتا ہے کہ فوری طور پر تاثر میں خیال کا پیدا ہوجانا ممکن تو ہے لیکن اس قدر اصرار کہ کسی کہنے والے کا یہ کہنا بھی کہ حضور ﷺ وفات پا گئے عمر رضی اللہ عنہ کو برداشت نہیں اور اعلان فرماتے ہیں کہ جس نے ایسا کہا اس کا سرقلم کردوں گا اور اس پر مزید یہ کہ حلفیہ اعلان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے وفات نہیں پائی۔ اور جب تک سابق مذکورہ امور نہ ہو پائیں گے رسالت مآب ﷺ کی وفات نہیں ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حلفیہ اعلان اور اس درجہ وثوق اور تیقن سے گمان ہوتا ہے کہ یہ خیال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی قطعی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور پہلے سے قائم ہوا تھا اور اس کا منشاء تھا ضرور تھا خواہ اس کے سمجھنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجتہادی لغزش ہوئی ہے۔ مگر وہ منشاء فی نفسہ یقینی اور قطعی تھا۔

واقعہ بھی یہی ہے ایسا ہوا ہے۔ امام بخاری کتاب الاحکام باب الاستخلاف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ذکر کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی وفات کے دوسرے دن کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکر خاموش بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے توقع تھی کہ حضور ﷺ زندہ رہیں گے اور ہم پہلے اور حضور ﷺ ہمارے بعد فوت ہوں گے اور عقیل عن ابن شہاب کی روایت میں یہ ہے کہ کل جو میں نے کہا تھا کہ حضور ﷺ کی وفات نہیں ہوئی ہے۔ وہ ایسا نہیں تھا جیسے کہ میں نے کہا تھا۔ اللہ کی قسم! جو میں نے کہا نہ وہ قرآن شریف میں ایسا پاتا ہوں اور نہ مجھے حضور ﷺ نے کبھی ایسا فرمایا تھا۔ لیکن میں ایسی توقع کرتا تھا کہ ہم پہلے اور حضور ﷺ ہمارے بعد فوت ہوں گے اور چونکہ میں نے اپنی توقع کے خلاف اپنی زندگی میں حضور ﷺ کی وفات کی خبر سنی اور کچھ طبعی حزن اور مفارقت نبوی کا صدمہ تھا۔ مجھے زیادہ تامل اور سوچ کا موقعہ نہیں ملا۔

چونکہ ابن اسحاق نے اس اعتذار کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے وضاحت اور تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس لئے میں اس کو بھی ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ذکر سے نقل کرنا چاہتا ہوں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں "حدثنی حسین بن عبداللہ عن عکرمة عن ابن عباس" "ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کسی ضرورت سے میں آپ کے ساتھ جارہا تھا۔ ہم دونوں کے ساتھ کوئی تیسرا نہیں تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے جی میں بولتے ہوئے جاتے تھے۔ دفعۃً میری طرف توجہ فرمائی اور فرمایا ابن عباس رضی اللہ عنہ جانتے ہو میں نے حضور ﷺ کی وفات کے جو کچھ کہا تھا کیوں کہا تھا۔ اس کہنے کی وجہ کیا تھی؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا امیرالمؤمنین میں نہیں جانتا آپ ہی جانتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے اس کہنے کی حضور ﷺ کی وفات کے واقع ہوچکنے کا منشاء سورۃ بقرہ کی یہ آیت تھی "وکذالک جعلنا کم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا" (البقرۃ:۱۴۳) اللہ کی قسم میں ضرور یہ گمان کرتا تھا کہ رسالت مآب ﷺ امت میں باقی اور زندہ رہیں گے۔ یہاں تک کہ امت کے آخری اعمال پر شہادت دیں گے۔ اس گمان نے اس کہنے پر مجبور کیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۴ ص ۱۴۴، ۳۴۳، اعتذار عمر لمدعنہ یوم وفاۃ النبی ﷺ)

غرض یہ کہ آیت میں امت پر حضور ﷺ کی شہادت مذکور ہے اور آیت میں اولین مخاطب اور اولین امت وہی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو نزول آیت کے وقت موجود اور آیت میں مخاطب ہیں۔ اس لئے مجھے گمان ہوتا تھا کہ ہمارے آخری اعمال کو رسالت مآب ﷺ ضرور دیکھیں گے۔ اس لئے کہ آپ اگلے اور پچھلے تمام اعمال امت

پر گواہی دیں گے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ یہ امت آپ سے پہلے فوت ہوگی اور رسالت مآب ﷺ امت کی وفات کے بعد فوت ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے وفات کے دن حضور ﷺ کی وفات کا انکار کرنا اس مذکورہ اعتذار کی وجہ سے تھا اور مذکورہ آیت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس خیال کا منشاء سمجھ رہے تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جوابی خطبہ میں یہ بتلانا چاہا کہ اس دن کی صورت حال سے بہت پیشتر جنگ احد کے بارے میں جو آیات اتری ہیں ان میں وہی آیت جو اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی تھی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے استدلال پیش کیا ہے کہ حضور ﷺ کی وفات تمہاری وفات سے پہلے ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا ہوجائے تو تم دین پر مستقل اور ثابت قدم رہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مذکورہ آیت کے غیر مراد معنی کے سمجھنے کا احساس پیدا ہوا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ارشاد پر تسلی ہوگئی کہ تقدیر الٰہی پوری ہوگئی ہے اور سمجھا گیا اگر رسول ﷺ کی شہادت دینے کے لئے حضور ﷺ کی حیات اور موجودگی ضروری ہے تو اس آیت میں دوسرے لوگوں پر امت کی شہادت بھی مذکور ہے تو پھر امت کی حیات اور موجود ہونا بھی دوسرے لوگوں کی حیات اور موجودگی میں ضرور ہونا چاہئے تھا۔

شہادت کے لئے علم اور عدل ضروری ہے، حضور ﷺ کے علم و عدل میں شک نہیں۔ اس لئے کہ رسول کا رسول ہونا ہی علم و عدل کی شہادت اور ضامن ہے اور امت کے عدل کی قرآن شریف تصدیق کرتا ہے۔ حضور ﷺ کو امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر برے بھلے جانتے ہیں، اچھے اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور برے اعمال پر استغفار کرتے ہیں اور اگلوں کے تمام واقعات حضور ﷺ سے سنے گئے اور جانے گئے ہیں۔ حضور ﷺ کو ان کے معلوم ہونے میں کیا شک۔ امت نے حضور ﷺ سے سب کچھ سن لیا ہے اور اللہ کی کتاب سے سمجھ لیا ہے اور اس قدر شہادت کے لئے کافی ہے۔

حضرات شیخین کا عندیہ حیات

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خطبہ آپ نے پڑھ لیا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خطبہ جس مقصد کے لئے تھا اس کے شروع کرنے سے پہلے آپ نے یہ فرمایا ہے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ دو موتوں کو جمع نہیں کرے گا اور اس ارشاد میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جو ارادہ تھا وہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس ارشاد میں یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ عام اموات کو قبر میں جو عارضی کچھ وقفہ کے لئے حیات دی گئی ہے اور اس کے بعد ان کو موت دی جاتی ہے اور حشر کے دن نفخہ ثانیہ کے بعد ان کو جسمانی اور دنیا کی حیات جیسی زندگی دی جائے گی اور عام اموات کو اس عارضی حیات کے بعد جو دوسری موت دی گئی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے بھی نعیم و عذاب کے لئے اموات کی برزخی اور روحانی زندگی کا سلف صالح نے اعتراف کیا ہے اور صحیح احادیث میں ان کی ایسی زندگی کی تصریحات ہیں اور حضور ﷺ سے خصوصیت کے ساتھ اس دوسری موت کا قبر میں نفی کرنے میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ اعلان فرماتے ہیں کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی مستمر حیات کا وقت برزخ میں داخل ہونے کی ابتداء سے ہوتا ہے اور یہ حیات اس پہلی موت سے قبل دنیاوی حیات کا ہمرنگ برزخ میں دنیاوی زندگی ہے اور جس طرح عام اموات کی جسمانی اور دنیاوی زندگی قبر میں دوسری موت کے بعد نفخہ ثانیہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے ”فاذاھم من الاجداث الی ربھم ینسلون“ پھر تبھی وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف چپل پڑیں گے۔ (یٰسین:۵۱)

اسی طرح حضور ﷺ کی جسمانی اور دنیاوی زندگی اس پہلی موت کے بعد شروع ہوگی اور نفخہ اولیٰ تک قائم اور دائم رہے گی اور نفخہ ثانیہ کے ساتھ جب عام اموات قبروں سے زندہ ہوکر اٹھیں گے۔ اس وقت حضور ﷺ کو غشی

سے افاقہ ہوگا۔ چونکہ غشی اور غشی سے افاقہ تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے جسمانی زندگی تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ برزخ کی ابتداء سے قیامت کے دن تک حضور ﷺ رسالت مآب کی حیات کے استمرار اور دوام کا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا ہے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ اعلان سنا ہے اور خاموش رہے۔ کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس اعلان کرنے میں صحابہ کو پورا اتفاق ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی اس پہلی موت کے متصل برزخ کی ابتداء سے قیامت کے دن تک حضور ﷺ کی جسمانی حیات کے استمرار اور دوام کے اعلان کو اس درجہ اہم سمجھتے تھے کہ حضور ﷺ کی جسمانی اور دنیاوی موت کے ذکر کرنے سے پیشتر اس کی ضد جسمانی اور دنیاوی حیات کا قیامت کے دن تک کے امتداد کو بیان فرمایا اور اہل السنۃ والجماعت کا مسلک بھی یہی ہے کہ اس پہلی دنیاوی موت کے بعد قیامت تک حضور ﷺ کی جسمانی حیات پھیلی ہوئی ہے۔

چنانچہ حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی شافعی متوفی ۹۰۲ھ کہتے ہیں بیہقی نے جواب دیا اور اس کا حاصل یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے میری روح کو مجھ پر لوٹا دیا ہے۔ یعنی حضور ﷺ اس کے بعد جب فوت ہو گئے اور دفنائے گئے تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت آپ کی روح آپ کو واپس کر دی ہے تاکہ جو آپ پر سلام پڑھے اس کو جواب عنایت فرمائیں اور حضور ﷺ کی مقدس روح ہمیشہ آپ کے پاکیزہ جسم میں ہے نہ یہ کہ وہ کبھی جسم میں آتی ہے اور کبھی جسم سے جاتی ہے۔ (القول البدیع ص ۱۲۷)

حافظ سخاوی رحمہ اللہ کی یہ بحث اس حدیث میں ہے جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ جو حضور ﷺ پر سلام پڑھتا ہے تو حضور ﷺ اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ اس لئے روح کے لوٹانے کا سبب سلام کا جواب دینا متعین فرمایا ہے۔ ورنہ دوسرے امور بھی حضور ﷺ کی جسمانی حیات کی شہادت دیتے ہیں۔

باب رابع کے اس حدیث کے فوائد پر حافظ سخاوی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ہم ان مذکورہ حدیثوں کے یہ نتائج سمجھتے ہیں کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی برزخ میں زندگی دائمی اور جسمانی ہے اور یہ اس لئے کہ عادۃً یہ محال ہے کہ کوئی وقت بھی ایسا گزر جائے۔ جس میں کوئی ایک بھی رات دن میں حضور ﷺ پر سلام نہ پڑھے۔ ہم ایمان لائے ہیں۔ صحیح اور سچ سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ زندہ ہیں اور قبر میں آپ کو رزق ملتا ہے اور حضور ﷺ کے جسد شریف کو ہرگز زمین نہیں کھائے گی اور اس پر اجماع ہے۔ (القول البدیع ص ۱۳۵)

سلام کا جواب دینا اصل حیات سے زائد مقصد حیات اور فعل حیات ہے اور صرف برزخی اور روحانی زندگی میں میت کا کوئی فعل متصور نہیں ہے اور نیز رزق کھانا پینا جسم کی ضروریات اور لوازمات سے ہے اور حیات کا فعل اور مقصد حیات ہے۔ نفس حیات سے زائد ہے۔ اس لئے حافظ کے حسب ارشاد ہم یہ سمجھتے ہیں کہ محدثین کو حضرت رسالت مآب ﷺ کی جسمانی حیات کے دوام اور برزخ میں اتصال کے وقت سے استمرار پر اجماع ہے۔

اب جو شخص محدثین امت اور پاسبانان علوم نبویہ کے خلاف قبر میں حضور ﷺ کی جسمانی زندگی کا انکار اور قبر میں شریف ترین جسد نبوی کو مردہ اور بے جان سمجھتے ہیں ان کی مرضی ہے۔ ورنہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک کوئی فقیہ النفس صاحب علم اس قول وانکار کی تائید نہیں کرتا ہے۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فکر ونظر یہ ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ اپنے آرام گاہ میں دنیا کی حیات کی طرح زندہ ہیں اور دنیا کی حیات میں آپ کی آواز پر آواز بلند کرنا اس قدر جرم عظیم تھا کہ اپنے تمام کئے ہوئے نیک اعمال کے اکارت جانے کا سبب تھا۔ اسی طرح حضور ﷺ کی قبر کے پاس یا قریب آواز کو بلند

کرنا آپ کو ایذا اور اذیت ہے اور اس درجہ جرم ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر سخت تکلیف دینے کا ڈر سنایا ہے۔

ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ دو نیک آدمی ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما قریب تھا کہ ہلاک ہوں، ان دونوں نے رسول اللہ کے سامنے اس وقت آوازیں بلند کیں۔ جب کہ بنی تمیم کے سوار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے لئے امیر مقرر کرنے کی التجا لے کر آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اقرع بن حابس کی طرف اشارہ کیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کسی اور کی طرف اشارہ کیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا۔ تم نے صرف میری مخالفت کا ارادہ کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس خیال سے نہیں کہتا۔ اس وقت ان دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ حجرات کی یہ آیات نازل فرمادیں (اے ایمان والو نبی کی آواز سے زیادہ اور اونچی آواز مت نکالو۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر آہستہ بولتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دوبارہ پوچھنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ (بخاری تفسیر سورہ حجرات)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی آواز کے پست کرنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہت ہی آہستہ بولنے پر مذکورہ آیت سے استدلال کرتے تھے اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بولتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے تمہاری آواز تمہارے بولنے کے وقت اونچی نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ قرآن شریف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بولنے اور اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت کرتا ہے۔

چنانچہ بخاری رحمہ اللہ ابن جریج کے طریقہ سے اس باب میں روایت کرتے ہیں کہ ابن ابی ملیکہ نے ابن جریج کو کہا تھا کہ یہ واقعہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آپس میں جب بولتے اور تکرار کے وقت آوازیں بلند ہوئیں تو سورۃ حجرات کی پہلی آیت نازل ہوئی۔ اے ایمان والو! بولنے میں اللہ کے سامنے اور اللہ کے رسول کے سامنے پیش قدمی مت کرو عظیم تک الخ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بولنے سے پیشتر خود بولنے کی جرأت مت کرو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ لینے کی توقع میں خاموش رہو اور فیصلہ لینے کا انتظار کرو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بے تکلف ترنخ کر بات مت کرو۔ اگر بولنے کی ضرورت پڑ گئی ہے تو نرم آواز سے تعظیم واحترام کے لہجہ میں بولو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں قرآنی ارشادات کے معانی جم کر بیٹھ گئے تھے۔

اس کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بولتے تو بہت آہستہ آہستہ بولتے تھے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ اور تہدید پڑھئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آرام گاہ نبوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور کس قسم کی حیات کو سمجھتے اور یقین کرتے ہیں۔

حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں: میں مسجد میں کھڑا تھا کہ ایک شخص نے مجھے کنکری ماری۔ میں نے ادھر کو دیکھا تو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ فرمایا یہ دو آدمی بلا کر لاؤ میں ان دونوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بلا کر لایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تم کہاں کے ہو انہوں نے کہا ہم طائف کے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تم شہر کے رہنے والے ہوتے تو تمہیں تکلیف اور درد کا مزہ چکھاتا۔ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں چیخ کر چلا کر بول رہے ہو۔
(بخاری کتاب الصلوٰۃ باب رفع الصوت فی المسجد ص ۶۷)

بعض روایات میں ایسا مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم کو ایسے کوڑے مارتا کہ بدن درد کرنے لگتا۔ ان حضرات طائف کے باشندوں کے زور زور سے بولنے اور اس تہدید کے سنانے کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر سورۃ حجرات کی وہی مذکورہ آیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بولنے کی پیش قدمی اور چلانے کی خلاف ادب

گستاخی اور مجرمانہ ایذاء کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یقین ہے کہ آرام گاہ نبوت کے قرب میں شان نبوت کے شایان تعظیم واحترام کے خلاف اس قسم کے اقدامات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تکدر مزاج کے باعث ہیں اور مسجد نبوی کی تخصیص کی وجہ یہی ہے کہ آرام گاہ نبوت اور مسجد نبوی میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ خصوصاً اس وقت کے لحاظ سے تو قرب بھی قریب تر تھا۔

اس تخصیص اور اس قبر کے پیش نظر یقین ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تہدید کے لئے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حیات اور جسمانی مجلس کے یقین اور اعتقاد کے سوا دوسری کوئی وجہ نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کی تخصیص قرب آرام گاہ کے لحاظ کے بغیر ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور آستانہ نبوت کا قرب اس تہدید کا داعی نہیں ہوسکتا۔ اگر آستانہ نبوت میں اس مقدس جسد کی حیات کا عمر رضی اللہ عنہ کو یقین اور اعتقاد نہیں ہے تو صرف بے جان اور مردہ لاش کی نعوذ باللہ ایذا کا تصور اور یہ قانونی اور آسانی تعزیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے کب اور کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ تہدید اس وجہ سے نہیں تھی کہ وہ مسجد نبوی میں بول رہے تھے اور مسجد کے احترام کے خلاف ان کو ان کے چلانے پر ایسی شدید تہدید کی ہے۔ اس کے جواب میں بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں اس ایک جواب کو پسند کرتا ہوں کہ وہ اختصار کے ساتھ یقینی بھی ہے۔

وہ یہ ہے کہ بخاری رحمہ اللہ نے اسی باب میں اور اس سے دس ابواب پیشتر باب التقاضی میں حضرت کعب سے روایت کیا ہے کہ: حضرت کعب نے مسجد نبوی میں ابن ابی حدرد سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا اور ان دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تھے۔ ان کی طرف نکلے یہاں تک کہ آپ نے اپنے حجرہ کا پردہ کھول دیا اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو پکارا۔ کعب نے لبیک کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے کعب کو اشارہ کیا کہ آدھا قرض معاف کردو اور ابن ابی حدرد سے فرمایا اٹھو اور قرض ادا کردو۔ (بخاری باب التقاضی فی المسجد کتاب الصلوٰۃ باب رفع الصوت فی المسجد)

اور بخاری رحمہ اللہ کتاب الصلح باب ھل یشیر الامام بالصلح میں اعرج کے طریقہ سے اس حدیث میں ذکر کرتے ہیں: کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گزرتے ہوئے حضرت کعب کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ آدھا قرض چھوڑ دو۔

مسجد نبوی میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ اور آپ کے مدیون کی آوازیں مسجد نبوی میں بلند ہورہی ہیں اور اعرج کی روایت کے مطابق ان پر گزرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب کو سمجھا دیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کو اعرج کے اس کہنے پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پر گزرے کچھ استبعاد ہے۔ مگر یہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ مبارک میں داخل ہوتے وقت ان پر گزرے ہوں اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو جو فرمانا چاہا تھا فرمادیا ہو تو پھر دوبارہ ان کی طرف نکلنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی اور اگر حجرہ سے نکلنے کے بعد ان کی طرف کعب کو ارشاد فرماتے ہوئے ان پر گزر رہے ہیں تو پھر حافظ کا اعرج کے بیان پر استبعاد نہیں ہوتا ہے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح میں باب التقاضی میں اس طرح لکھا ہے۔ اب یہ واقعہ مسجد میں مسجد نبوی کا خصوصی واقعہ ہے اور دونوں حضرات کی مسجد میں نبوی آوازیں بلند ہورہی ہیں۔ لیکن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں ہیں۔ اگرچہ حجرہ کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آوازوں کو اس قدر ضرور محسوس کرلیا ہے کہ آپ ان کی طرف کو نکلے۔ لیکن گزرتے ہوئے ان کو صلح کرنے کا اشارہ فرمایا۔ مگر کسی قسم کی ادنیٰ تنبیہ نہیں کی کہ مسجد نبوی میں ان کی آوازیں بلند ہوگئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مزاج جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کے ہوتے ہوئے اس کے خلاف کیا۔ مسجد نبوی میں رفع اصوات کو اس قدر جرم اور اس شدید تہدید کو جائز قرار دے دیں گے۔

اور بخاری رحمہ اللہ خود اس ایک باب میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث کو سائب بن یزید کی حدیث کے بعد اس لئے روایت کرتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ سائب بن یزید کی حدیث میں حضرت عمر کی مذکورہ تہدید مسجد نبوی میں ان کی آوازوں کے بلند کرنے کی وجہ سے نہیں تھی۔ اس لئے کہ کعب بن مالک کی حدیث میں مسجد نبوی میں آوازوں کے بلند کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ قسم کی تنبیہ اور سرزنش نہیں فرمائی ہے۔ جو حضرات امام بخاری کی دقت فکر اور بالغ نظری کو جانتے ہیں۔ ان کو اس پر تعجب نہیں ہوگا کہ بخاری نے اس صنیع اور روش میں مسجد نبوی میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے علم اور سنت کو ظاہر کرنا چاہا تھا اور مساجد میں رفع اصوات کی نہی میں حدیثیں وارد ہیں۔ لیکن حافظ نے اور شیخ دونوں حذاق حدیث نے باب رفع الصوت اور باب التقاضی میں یہ لکھ دیا ہے کہ وہ تمام حدیثیں ضعیف ہیں اور بخاری رحمہ اللہ نے اشارۃ ان کے ضعف پر کعب بن مالک کی حدیث کے روایت کرنے میں تنبیہ کردی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سورۃ حجرات کی تفسیر میں لکھتے ہیں: اہل علم فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس آواز کو بلند کرنا اس درجہ برا ہے کہ جس درجہ آپ کی دنیا کی حیات میں آپ کے قریب، آپ کی مجلس میں آواز کا بلند کرنا برا تھا۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی زندگی اور آرام گاہ دونوں میں ہمیشہ محترم ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۲۰۷)

آپ سوچئے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجموعہ روح اور جسد میں مخص اور نبی ہیں یا صرف جسد میں۔ ظاہر ہے کہ مجموعہ روح اور جسد میں حضور مخص اور نبی ہیں۔ حافظ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جس شان نبوت سے دنیا کی زندگی میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم محترم تھے۔ اسی شان نبوت میں آرام گاہ نبوی کے اندر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم واجب الاحترام ہیں۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ آستانہ نبوت میں نبی علیہ السلام کے جسم کو بے جان لاش نعوذ باللہ بتلائیں یا اس کی سالمیت کو بھی داغ لگا دو کہ اس کے لئے بھی آپ کے خیال میں کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے۔ لیکن حقیقت واقعی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ خواہ ہمیں زمین کے اوپر دکھائی دیں یا زمین کے پردہ میں استراحت فرما ہوں۔ وہ یقیناً زندہ ہیں جیسے کہ اس دنیا کی زندگی میں آپ کے حاضر ہونے اور غائب ہونے سے آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

منکرین حیات کا استدلال

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خطبہ بالتفصیل آپ نے پڑھ لیا ہے۔ منکرین حیات اس خطبہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت واقع ہو چکنے بمعنی انقطاع حیات پر استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب انقطاع حیات ہو چکا ہے تو پھر قبر میں دوبارہ جسمانی حیات کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور ان کے خیال میں کسی صحیح دلیل سے جسمانی حیات ثابت نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے وہ سابق موت بمعنی انقطاع مستمر چلی جارہی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ حیات اور موت دونوں ضد اور ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ موت کی جگہ حیات آتی ہے اور حیات کی جگہ موت کا ورود ہوتا ہے۔ جب حق تعالیٰ چاہتا ہے تو موت کو حیات میں تبدیل کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے حیات کو موت میں بدل دیتا ہے۔ جس طرح حیات وجودی ہے اور اس کی اپنی حقیقت اور خلقت ہے۔ اسی طرح موت وجودی ہے اور اس کی اپنی حقیقت اور خلقت ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے ''خلق الموت والحیوٰت'' اللہ نے موت کو پیدا کیا اور حیات کو بھی پیدا کیا۔

سید آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: اہل السنت والجماعت کی اکثریت موت کو صفت وجودی اور حیات کی ضد تسلیم کرتی ہے اور ان کی دلیل قرآن شریف کی یہ آیت ہے اور اس آیت سے موت کے وجودی ہونے

پر استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا خلق اس کے متعلق اس بیان میں مذکور ہے اور خلق کا تعلق عدمی سے نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عدمیات ازلی ہیں۔ اس آیت میں موت کو اللہ کی مخلوق ظاہر کیا گیا ہے اور معدوم مخلوق نہیں ہوتا ہے۔ اگر موت کو عدمی کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس آیت کے خلاف اللہ کی مخلوق سے موت کو باہر کرنا چاہئے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بہشت اور جہنم کے درمیان اللہ کے اس اعلان کے بعد دیکھو یہ موت ہے جو لائی گئی ہے اور اس وقت بکری کی طرح موت ذبح کی جائے گی اور اعلان کیا جائے گا کہ موت ذبح کی گئی ہے۔ اب موت نہیں ہے، جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں اور دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۹۷، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۳۹۵)

یہ حدیث کھلم کھلا ہدایت کرتی ہے کہ موت وجودی ہے، اس لئے وہ لائی گئی اور وجودی ہے۔ اس لئے ذبح کی گئی۔ عدم کے لانے کا اور ذبح کرنے کا کچھ معنی نہیں۔ اس لئے معنی موت کو عدمی بتانا اور ازالہ حیات انقطاع حیات اس کا معنی بتلانا کتاب وسنت کے خلاف اور اہل سنت والجماعت کے مسلک سے باہر ہونے کے لئے مذبوحی حرکت ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں لفظ موت کو حضور ﷺ کی موت بمعنی انقطاع اور ازالہ حیات پر دلیل بتانا جبری استدلال تو ہوسکتا ہے۔ مگر اس معنی کے لئے لفظ موت سے استدلال کرنا حقیقت واقعی نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب وسنت میں جس معنی کے لئے موت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ اس معنی کے مترادف نہیں ہے۔

آپ کو بھی یقین ہوگا کہ کسی معنی مراد کے لئے جس قدر صحیح لفظ اور صحیح استعمال لفظ اور صحیح استعمال کتاب وسنت میں کیا گیا ہے اور کیا جاسکتا ہے اس کے قریب کسی ایسے شخص کا استعمال لفظ اور ٹھیک اس لفظ کا صحیح مدلولی معنی متعین کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ جس کا ذہن جاہلیت کے استعمال کے تصور سے خالی نہیں ہوسکتا ہے۔ موت کے متعلق جاہلی تصور یہ تھا کہ جب بدن سے روح الگ ہوجاتی ہے تو یہ موت ہے اور اس کے بعد نہ روح باقی ہے اور نہ جسد باقی ہے۔ ان کے اعتقاد میں دوبارہ روح اور جسد کا ملنا ناممکن تھا وہ کہا کرتے تھے کیا تم کو وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ اور ہوجاؤ مٹی اور ہڈیاں تو تم کو نکلنا ہے۔ کہاں ہوسکتا ہے، کہاں ہوسکتا ہے جو تم سے وعدہ ہوتا ہے۔ (مؤمنون: ۳۵، ۳۶)

آپ جانتے ہیں کہ قرآن شریف نے ان کا ذہن اور استعمال بدل ڈالا اور جس حقیقت کا زیادہ انکار کیا جاتا تھا اس کے تسلیم کرنے پر زیادہ اصرار کیا گیا۔ آپ کدھر کا رخ لے رہے ہیں کہ کسی ایسے کی امداد سے آپ موت کا انقطاع حیات معنی کرنا چاہتے ہیں۔ جن کے علم پر اس درجہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ جس کے اوپر دوسرا درجہ نہیں ہے اور نہ ان کو خود یہ دعویٰ ہوا ہے کہ ان کے علم اور الفاظ کے استعمال نے تمام ان معانی کا احاطہ کرلیا ہے۔ جن کے لئے وہ لفظ مستعمل ہوسکتا ہے اور پھر اہل علم سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کسی لغت میں یہ بتادیا جائے کہ موت کا استعمال ایسے حال کے لئے کیا گیا ہے۔ جس میں زندگی باقی تھی۔ اہل لغت لفظ موت کا استعمال ایسے حال کے لئے جس میں زندگی باقی اور قائم ہے جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ ہم اس سے بحث نہیں کرتے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ کتاب اور سنت کی زبان میں ایسے حال کے لئے جس میں زندگی باقی اور قائم ہے۔ بکثرت لفظ موت کا استعمال کیا گیا ہے اور موت کی ٹھیک حقیقت پر پوری اور صاف روشنی ڈالی گئی ہے۔

پھر حال کے لئے جس میں زندگی بھی باقی ہے اور اس پر موت کا اطلاق بھی کیا جاتا ہے یا کیا گیا ہے لغت میں موت کے لئے لغوی معنی کی تلاش کرنے کی کیا مجبوری ہے۔ کیا کتاب وسنت پر اعتماد کی کمی ہے یا کتاب وسنت کے وقوف اور علم میں کچھ خامی محسوس کی گئی ہے یا کتاب وسنت کی حقیقت واقعی کی تسلیم نہ کرنے کے لئے لغت کو آڑ اور بہانہ بنایا جارہا ہے۔ کیا آپ مناسب اور ضروری سمجھتے ہیں کہ لغت میں اگر لفظ موت انقطاع حیات کے لئے استعمال

کیا گیا ہے، جو آپ کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے مفید پڑتا ہے۔کیا موت کے اس معنی کے مراد لینے پر مقدم رکھا جائے۔جس معنی اور جس حال کے لئے اس کو کتاب اور سنت نے استعمال فرمایا ہے۔

کتاب وسنت میں موت کا معنی کیا ہے؟

سورہ زمر میں ارشاد فرمایا گیا ہے"اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخریٰ"(زمر:۴۲)ترجمہ:(اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہوان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرایا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وعدہ مقرر تک)

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ نفس کی توفی کے بعد ایک موت کا وقت ہے اور دوسرا نیند کا وقت اور ایک حال امساک کا ہے اور دوسرا حال ارسال کا۔امساک کی حالت میں موت کے وقت روح روک لی گئی ہے۔اس کی حیات کا مقصد روک لیا گیا۔اس کی علمی زندگی بند کردی گئی ہے اور ارسال کے حال میں نیند کے وقت روح واپس کردی گئی۔ابھی اس کے روکنے کا وقت باقی تھا اس کو عملی زندگی کا موقعہ دیا گیا۔اگرچہ نیند کے وقت بھی ارسال سے پیشتر امساک تھا اور یہ ظاہر ہے کہ تقدم امساک پر آیت مذکورہ ارسال دلالت کرتا ہے۔مگر توفی اور امساک موت اور نیند دونوں حالتوں میں ہے۔مگر یہ رب کی مرضی ہے کہ موت کے وقت موت کی حد پر امساک کو رکھتا ہے اور وہ جانتا ہے جس نفس کی حیات کا وقت ختم ہوتا ہے اور نیند کے وقت بھی امساک ہے۔مگر موت کی حد پر نہیں بلکہ ارسال کی حد پر ہے، رب جانتا ہے کہ ابھی اس کا وقت مقررہ باقی ہے۔

آپ سوچئے کہ قوت عملی کے امساک اور ارسال کے سوا امت اور حیات کی دوسری حقیقت کیا ہے۔نفس کی حیات کو جب اس کے جسم پر اللہ تعالیٰ نے پھیلنے سے روک دیا تو یہ اس کی موت ہے اور جب نفس کو اس کے جسم پر حیات پھیلانے کا موقعہ دیا گیا تو یہ اس کی حیات ہے اور جب نیند اور موت دونوں میں امساک ہے مگر نیند کی حد میں ہے یا موت کی حد پر یہ اللہ کو معلوم ہے۔ہم اس قدر ضرور جانتے ہیں کہ نیند میں بھی قوت عملی روک لی گئی ہے نہ جسم غیر طبعی حرکت کرتا ہے نہ آنکھ کسی ظاہر شئے کو دیکھتی ہے نہ باہر کی آواز کو کان سنتا ہے۔تمام حواس ظاہرہ معطل ہیں اس کے ظاہر پر امساک چھایا ہے اور اس کی روح قوت عملی سے روک لی گئی ہے اور اس کی روح کی حیات اس کے جسم پر بند کردی گئی۔

مگر اس حال میں بھی ابھی زندگی باقی ہے۔اگرچہ حس اور شعور زائل ہو چکا ہے مگر جو باطن میں زندگی قائم ہے خواہ اس کا سبب کچھ بھی ہو مگر اس کے آثار ظاہر ہیں۔کھانا ہضم ہورہا ہے، نبض چلتا ہے، ارسال کے وقت کا انتظار باقی ہے۔مگر زبان رسالت نے اس کو موت بتادیا ہے۔آگے اس کا ذکر آتا ہے۔قرآن شریف کی مذکورہ آیت کی طرح حدیث نبوی نے بھی موت اور حیات کی بھی حقیقت بتائی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مذکور ہے:حضور ﷺ فرماتے ہیں:جب تم اپنے بچھونے پر آؤ تو یوں کہو اے میرے رب تیرے نام پر میں نے اپنا کروٹ رکھا ہے اور تیری مدد سے اٹھاؤں گا۔اے میرے اللہ!اگر تو نے میرے نفس کو روک لیا تو اس پر رحم فرما اور اگر اس کو واپس بھیج دیا تو اس کی حفاظت فرما۔ (بخاری کتاب الدعوات ص ۹۳۵)

حدیث میں امساک اور ارسال مذکور ہیں، امساک چونکہ موت ہے اور اس کے مناسب رحمت ہے اور ارسال حیات ہے دنیا میں باقی رہنا ہے۔اس کے مناسب حفاظت ہے۔اس لئے حدیث میں امساک کے بعد رحمت اور ارسال کے بعد حفاظت مذکور ہے۔اس حدیث میں بھی امساک کو موت اور ارسال کو حیات فرمایا گیا ہے

اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ نیند میں امساک ہے لیکن معلوم نہیں ہے کہ وہ موت کی حد پر ہے یا ارسال تک موقت ہے۔ مگر امساک ضرور ہے۔ ظاہر کے تعطل کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر قیام حیات کا اعتراف بھی ظاہر ہے۔ نیند کی حالت ایسی ہے جس میں زندگی باقی ہے اور امساک بھی زبان رسالت میں موت ہے۔ اس حدیث کے مضمون بیان کرنے میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں امساک کی جگہ موت کی اور ارسال کی جگہ حیات کی تصریح کی ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے ایک صاحب کو فرمایا: جب تم اپنے بچھونے پر سونے کے لئے کروٹ لگاؤ تو یوں کہو اے اللہ تو نے میرے نفس کو خلق فرمایا اور تو ہی اس کو کھینچے گا میرے نفس کی زندگی اور موت تیرے ہی لئے ہے۔ اگر تو اس کو زندہ رکھے تو اس کی حفاظت فرما اور اگر تو اس کو موت دے تو اس پر رحم فرما۔ (نسائی، ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے) (فتح الباری ج ۱۱ ص ۱۰۶)

یہ دوسری حدیث بھی صحت میں بخاری کی حدیث کے برابر اور ہم پلہ ہے۔ بخاری کی حدیث میں سوتے وقت کی دعا میں امساک اور ارسال فرمانا اور نسائی کی حدیث میں سوتے وقت کی دعا میں امساک اور ارسال کی جگہ موت اور حیات فرمانا صریح نص ہے کہ موت امساک نفس، نفس کے تعطل قوت عملی کے روکنے کا نام اور حیات ارسال نفس، نفس کو قوت عملی کے موقع دینے کا نام ہے۔ کتاب وسنت میں جب موت اور حیات امساک نفس اور ارسال نفس کا نام ہے تو پھر موت کے وجودی ہونے میں کیا شبہ اور اس کے مفہوم میں ازالہ حیات اور انقطاع حیات کا اختراع کرنے میں کیا شک ہے۔

حق تعالیٰ جب کسی نفس کی صفت حیات کو اس کی صفت موت میں بدلنا چاہتا ہے تو اس کی روح کو نکالتا ہے اور اس کی مرضی ہے کہ اس کی روح کے اخراج اور امساک کو اس حد پر پہنچا دے جس پر حیات کا اطلاق نہیں ہوتا ہے یا اس حد پر چھوڑ دے جس میں کچھ زندگی ہے اور اس پر موت کا اطلاق صحیح ہے۔ زبان رسالت نے اس کو موت فرمایا ہے۔

صحیح بخاری کتاب الدعوات میں مذکور ہے، حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ جب اپنے استراحت کے بستر سے اٹھتے تھے تو یوں فرماتے تھے سب خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں مرجانے کے بعد زندہ کیا۔ (بخاری ص ۹۳۴)

اور جامع ترمذی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایسا مذکور ہے: حضور ﷺ نے فرمایا جب نیند سے جاگ جائے تو یوں کہنا چاہئے سب خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے میرے جسد میں عافیت بخشی اور میری روح کو مجھ پر لوٹا دیا اور اس کو اپنے ذکر کی اجازت عنایت فرمائی۔ (ترمذی کتاب الدعوات ص ۱۷۶)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نوم کی حالت کو حضور ﷺ نے موت فرمایا اور جاگ جانے کو حیات اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بیدار ہو جانے کے بعد کی حالت کو بتایا گیا کہ اس کی روح جو اس کی نیند میں قبض کر لی گئی تھی اس کو واپس لوٹائی گئی اور اس کو اللہ کے ذکر کی اجازت دی گئی۔ جب کہ وہ روک دی گئی تھی۔ اس حدیث نے تو یہ بھی ظاہر کر دیا کہ عمل اللہ کی یاد سے جو منفعت حیات ہے اگر روح کو روک دیا جائے تو یہ موت ہے اور اگر عمل طاعت یاد الٰہی جاری ہے تو یہ اس نفس کی حیات ہے۔ منفعت حیات زندگی ہے اور منفعت حیات کو روکنا موت ہے۔

چنانچہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا: جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو اپنے رب کو یاد نہیں کرتا ان کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔ (بخاری ج ۲ ص ۹۴۸)

اور ذکر تسبیح وتحمید کی طرح ہر اس ذکر کو نماز، حج، جہاد وغیرہ کو شامل ہے۔ جس میں اللہ کی عظمت کا استحضار اور تعظیم کا استشعار ہے۔ جب آپ جانتے ہیں کہ یہ تمام اعمال غیر جسمانی حیات کے مقاصد ہیں۔ جسم کی حیات کے بغیر صرف روح کی حیات میں یہ اعمال ناممکن ہیں تو جب ہم سنتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں، حج کرتے ہیں، قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کی جسمانی حیات میں کیوں شک ہوتا ہے اور ان کی جسمانی حیات کے تسلیم کرنے سے مانع کیا ہے۔

امام طیبی ﷫ حضرت کی مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: نوم پر حضور ﷺ کے ارشاد میں اس لئے موت کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس میں سر یہ ہے کہ زندگی سے انسان کا انتفاع تب ہی ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا اور طاعت کی کوشش اور قصد کرتا ہے اور اس کی سزا اور غضب کے کاموں سے اجتناب کرتا ہے اور جب وہ سوتا ہے تو اس کا یہ انتفاع رک جاتا ہے تو وہ ایسا ہے جیسا مردہ۔ اس لئے کہ وہ اس انتفاع سے روک دیا گیا۔ اللہ کی حمد ہے اس نعمت حیات پر کہ اس نے بخشی اور اس مانع انتفاع پر جو سنت کی نگاہ میں موت ہے اور اس اطلاق کی یہ حکمت اور سر اس حدیث کے مضمون کے مطابق ہے۔ جس میں یہ مذکور ہے (یا اللہ اگر تو نے میری روح کو مجھے واپس بھیج دیا تو اس کی ایسی حفاظت کر جیسے کہ تو نیک بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔ (فتح الباری ج۱۱ ص۹۵)

حضرت حذیفہ کی مذکورہ حدیث براء بن عازب، ابی ذر غفاری سے بھی جامع صغیر میں مذکور ہے۔ اس کی شرح میں حضرت علامہ مناوی ﷫ لکھتے ہیں: اس حدیث میں حضور ﷺ نے نیند کو اس لئے موت فرمایا ہے کہ نیند میں بھی عقل زائل ہوتی ہے اور حرکت بند ہوتی ہے اور اس لئے کہا گیا ہے کہ نوم حقیقت موت ہے اور موت ثقیل نوم ہے اور کہا ہے "النوم اخو الموت" اور نوم مانع ہے تقرب بالعبادات سے۔ اس لئے بیدار ہونے کے بعد زوال مانع کے اس نعمت پر خدا کی حمد کرنے کو فرمایا۔ (فیض القدیر ج۵ ص۹۱)

غرض یہ ہے کہ نوم میں حس وحرکت فکر وشعور کا ازالہ اور تعطل ہوتا ہے اور یہ موت کے مناسب امور ہیں۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس تعطل کی بنیاد اور مناسبت سے نوم کو موت فرمایا ہے اور یہ ایک محاورہ ہے کہ نیند کو خفیف موت کہتے ہیں اور موت کو ثقیل شدید نوم کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نوم اور موت دونوں بہنیں ہیں۔ نوم موت کی بہن ہے اور موت نوم کی بہن ہے۔ نیند میں یقیناً ازالہ حیات نہیں ہوتا ہے۔ مگر حضور ﷺ کے ارشاد میں اس کو موت فرمانا مذکور ہے اور محاورہ میں اس کو خفیف موت کہا جاتا ہے اور موت میں اگر انقطاع حیات ضروری ہے تو اس کو شدید اور ثقیل نوم کہنا کیوں محاورہ ہے۔

ابی جحیفہ صحابی ﷜ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ سفر میں تھے اور صحابہ سو گئے تھے یہاں تک کہ سورج طلوع ہوا تو حضور ﷺ نے ان کو فرمایا بیشک تم مردہ پڑے تھے اللہ نے تم کو تمہارے ارواح کو واپس لوٹا دیا۔ جب تم نماز سے سو جاؤ تو اس وقت پڑھو جب تم بیدار ہو جاؤ۔ حافظ نور الدین علی بن ابی بکر ہیثمی فرماتے ہیں اس حدیث کو ابویعلی اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد)

صحابہ جب نیند سے جاگے ہیں تو ان کو حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ تم جاگنے سے پہلے مردہ تھے، تمہاری جانیں نکالی گئی تھیں۔ اللہ تعالی نے تم کو تمہاری جانیں واپس کر دیں تو تم جاگ گئے۔ حضور ﷺ نے سوئے ہوئے صحابہ ﷢ کو مردہ فرمایا اور ان کی نیند میں ان کی حیات ضرور باقی تھی۔

ابو ہریرہ ﷛ فرماتے ہیں: جس وقت اللہ تعالیٰ موحدین کو جہنم میں ڈالے گا ''اماتھم فیھا اماتۃً'' ان کو موت دے گا موت دینا۔ پس جب ان کو نکالنا چاہے گا تو اس وقت ان کو جہنم کا عذاب محسوس ہوگا۔ جامع صغیر میں لکھا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔ حافظ مناوی کہتے ہیں کہ ان کا حس اور شعور زائل کیا جائے گا تا کہ ان کو جہنم کا عذاب محسوس نہ ہو اور ان کو جہنم سے نکالنے کے وقت ان کو حس اور شعور دیا جائے گا۔ اس وقت ان کو جہنم کا عذاب بھی محسوس ہو جائے گا۔ (فیض القدیر ج اوّل ص ۲۵۲)

موحدین سابق روسیاہیوں میں جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ اگر چہ ادارہ پھرتے اور ٹیڑھے چلتے تھے۔ مگر اسلام کے اصول، اللہ کی توحید اور رسالت مآب ﷺ کی رسالت پر ایمان لائے تھے۔ اس لئے دوسرے کافروں سے امتیاز دینے کے لئے حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے موحدین کی جہنم میں ایسی حالت کردے گا کہ ان کو جہنم کا عذاب محسوس نہ ہوگا۔ مگر آخری وقت احساس وشعور کی واپسی پر ان کو محسوس ہو جائے گا۔ اگر چہ اس حدیث میں احتمال ہے کہ موحدین کو جہنم میں حقیقتاً موت دی جائے گی۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ بہشت اور دوزخ میں موت نہیں ہوگی۔ اس سے پہلے موت کے ذبح کرنے کا اعلان کیا جائے گا اور تمام مخلوق کے سامنے موت ذبح کی جائے گی۔

غرض یہ کہ کتاب اور سنت میں ایسے حال کو موت کہا گیا ہے جس میں اس شخص کے اندر اس کی روح موجود نہیں تھی۔ اس کا ظاہر معطل تھا۔ اس کی روح پوری حیات اس کے اندر پھیلنے سے روک دی گئی تھی۔ مگر اس کے اندر خواہ کسی حد اور کسی درجہ میں ہو زندگی تھی۔ حیات کا انقطاع نہیں کیا گیا تھا تو پھر کیا تعجب ہے کہ حضرت صدیق اکبر ﷛ نے کتاب وسنت کے اطلاقات مذکورہ کے پیش نظر حضور ﷺ کے ظاہری تعطل کو دیکھ کر جان کر آپ کے اس حال پر موت کا اطلاق کیا ہے۔ اگر چہ اس حال میں حیات باقی تھی، اس کا انقطاع نہیں ہوا تھا۔

لفظ مات کے اطلاق سے انقطاع حیات کی ضرورت پر اصرار کیوں ہے اور اس حال میں قیام حیات کے تسلیم کرنے میں تامل کیوں اور مانع کیا ہے اور کتاب وسنت میں مذکورہ اطلاقات کے ہوتے ہوئے ارباب لغت کے دروازہ کھٹکھٹانے اور در در خاک چھاننے کی ضرورت اور مجبوری کیا ہوگئی ہے اور جب ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جس کو رسالت مآب ﷺ نے وحی کی زبان میں اور اہل عرب نے زبان کے محاورہ میں موت کی بہن کہا ہے۔ یعنی نوم اس میں رسالت مآب ﷺ عوام کی سطح پر نہیں ہے۔ بلکہ رسالت مآب ﷺ کی نیند میں اور عام کی نیند میں اس درجہ فرق ہے۔ جس درجہ موت اور زندگی میں فرق ہوسکتا ہے اور جو لوگ موت کی دوسری بہن یعنی موت میں عوام کی سطح پر رسالت مآب کو دیکھنا چاہتے ہیں اور عوام کی موت کی طرح رسالت مآب ﷺ کی موت انقطاع حیات کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں تو ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ جاہلی تصور ان کے ذہن ودماغ میں کہاں سے جم گیا ہے کہ شارع کی زبان میں انقطاع حیات ہی کا نام موت ہے۔

حضور ﷺ کی نیند میں اور عوام کی نیند میں فرق ہے

رسالت مآب ﷺ کی نیند ظاہر کی سطح سے باطن کی گہرائیوں تک اور ظاہر کے احساسات سے قلبی ادراکات تک متجاوز نہیں ہوتی ہے۔ عام انسان جب بیدار ہوتے ہیں تو ان کے قلوب بھی بیدار رہتے ہیں اور بیداری میں بھی صرف دنیا اور دنیا کی دیکھی پہچانی اشیاء کا ادراک کرتے ہیں۔ مگر رسالت مآب ﷺ کا قلب سونے میں بیدار رہتا ہے

اور بیداری بھی اس طرح کی بیداری کہ عالم غیب اس کے سامنے کھلا رہتا ہے اور اس کا ادراک فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے وحی لیتے ہیں، علم الٰہی کو حاصل کرتے ہیں اور محفوظ رکھتے ہیں۔ عام انسان پر جب نیند کی حالت میں پوری غفلت چھا جاتی ہے، نبی ﷺ پر اس حال میں بھی رب علیم جاتا ہے۔ کیا کیا عجیب اور خفیہ اسرار کھلتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ جب سوتے ہیں تو صرف آپ کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار رہتا ہے اور تمام انبیاء کا یہی حال ہوتا ہے۔ صرف ان کی آنکھیں سوتی ہیں اور ان کے دل بیدار رہتے ہیں۔ (بخاری ج اول ص ۵۰۴ کتاب المناقب)

ابن سعد نے ذکر کیا ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں: ہم انبیاء کے گروہ، ہماری آنکھیں سوتی ہیں اور ہمارے دل نہیں سوتے، بیدار رہتے ہیں۔ (خصائص کبریٰ ج اول ص ۶۹)

مذکورہ حدیثوں میں حضور ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ حضور ﷺ کی نیند آنکھوں تک محدود ہوتی ہے اور قلب نبوی جاگتا ہے، بیدار رہتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ عام انسانوں کی نیند میں حس وشعور کا ازالہ ہوتا ہے۔ ظاہر اور باطن دونوں معطل ہوتے، مگر حضور ﷺ کی نیند میں بیداری اور شعور قائم ہے۔ اگرچہ ظاہر میں نیند کے پردہ کے نیچے اس کا استتار ہے۔ عام انسانوں کی نیند میں بیداری کا ازالہ ہے اور حضور ﷺ کی نیند میں بیداری کا استتار ہے۔ اس پر کوئی بھی انکار اور تعجب نہیں کرتا۔ ممکن ہے اس کے بعد یا فی الحال اس کے انکار کے لئے بھی کوئی راہ نکالی گئی ہو یا کوئی تجویز سوچی جاتی ہو۔ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ کے قلب اور باطن کی بیداری کا اس درجہ یقین تھا کہ جب وہ دیکھتے تھے کہ حضور ﷺ استراحت فرماتے ہیں تو آپ خواب سے نہیں بیدار کئے جاتے تھے۔

اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ کے استراحت میں فرق آتا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا یقین تھا کہ ظاہر بیداری کی طرح نیند کے حال میں بھی آپ کا قلب مہبط وحی اور عالم قدس سے معانی اور استفادہ میں جاگتا ہے اور آپ کا حیات خواہ آپ بیدار ہوں یا استراحت فرما، دائمی ہے۔ آپ کی بیداری کسی وقت نہیں ٹوٹتی اور غفلت کے چھا جانے کا امکان نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے دوام حیات کا بھی خواہ استراحت فرما ہوں یا بیدار، غالباً منکرین حیات جسمانی بھی انکار نہیں کرتے ہیں۔ مگر جب دوام حیات کی خواہ زندگی ہو یا ایسا حال جس پر موت کا اطلاق کیا جاسکتا ہے تلقین کی جاتی ہے تو ان صاحبوں کو ادّعاء امتناع کی اس حد پر اصرار ہوتا ہے جس میں امکان عام کے لئے قطعاً گنجائش کو برداشت نہیں کرتے۔

عمران بن حصین فرماتے ہیں: ہم حضور ﷺ کو نیند سے نہیں بیدار کرتے تھے۔ اس لئے کہ ہم نہیں جانتے ہیں کہ نیند میں آپ کو کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ (بخاری ص ۴۹ کتاب التیمم)

اسی طرح مسلم نے باب قضاء الصلوٰۃ الفائتہ میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں یہ لکھا ہے: کہ صحابہ اس لئے حضور ﷺ کو خواب سے نہیں بیدار کرتے تھے کہ ان کو یہ ڈر ہوتا تھا کہ حضور ﷺ کو وحی ہوتی ہو اور ہم جگالیں تو وحی الٰہی کا انقطاع ہو جائے گا۔ (فتح الباری ج اول ص ۳۵۶)

صحابہ رضی اللہ عنہم کو یقین اور ہمیں اعتقاد ہے کہ حضور ﷺ کے تمام احساسات اور ادراکات نیند میں بیدار رہتے اور وحی جیسے نازک امر کے لئے ادراک میں بیداری سے اس حیات کی حد کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو آپ کی نیند میں ہوتا تھا اور اس حیات کی آخری حد تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب ہی دیکھا تھا اور اپنے بیٹے حضرت

اسماعیل علیہ السلام کی اتنی بڑی قربانی کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ مذکورہ حدیثوں سے عام انسانوں کی نیند میں اور رسالت مآب ﷺ کی نیند میں یہ فرق ظاہر ہے کہ عوام کی نیند میں شعور وحیات کا ازالہ ہے اور حضور ﷺ کی نیند میں ظاہر تعطل ہے۔ مگر استتار حیات ہے۔ بیداری اس حد تک موجود ہے۔ جس کے اوپر بیداری کی دوسری حد نہیں ہے۔

اسی طرح عوام کی نینداور حضور ﷺ کی نیند کی طرح عوام کی موت اور حضور ﷺ کی نیند میں انقطاع حیات اور استتار حیات کا فرق ہے۔ عوام کی موت میں حیات کا انقطاع ہوتا ہے اور حضور ﷺ کی موت میں حیات کا استتار ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موت اور نیند میں ایسی گہری مناسبات ہیں کہ علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ کے حسب قول سابق عرب کے محاورہ میں نیند کو خفیف موت کہا جاتا ہے اور موت کو گہری نیند کہا جاتا ہے اور ان دونوں میں اس قدر گہرا اتصال ہے کہ جہاں موت نہیں آتی ہے وہاں نیند کا عروض بھی ناممکن ہے اور جہاں نیند کا عروض ہوتا ہے وہاں پر موت ضرور وارد ہوتی ہے اور جس قسم کی نیند ہوگی اس کے مناسب موت ہوگی۔ اگر نیند میں تعطل انقطاع حیات کی حد پر ہے تو اس کی موت بھی انقطاع حیات کے مقام پر اور جس کی نینداستتار حیات کے مقام پر ہے تو اس کی موت بھی استتار حیات کی حد پر حضور ﷺ کی نیند میں صرف بیداری اور شعور کا استتار ہوتا تھا۔ اسی طرح حضور ﷺ کی موت بھی صرف استتار حیات ضروری ہے۔

نینداور موت دونوں بہنیں ہیں

عام لوگوں کی زبان پر معروف ہے، نیند موت کی بہن ہے اور رسالت مآب ﷺ کی زبان سے بھی یہ ارشاد ہے نیند موت کی بہن ہے اور اہل جنت نہیں مریں گے، پوچھنے والے نے پوچھا۔ اہل جنت سوتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اہل جنت نہیں سوئیں گے۔ جامع صغیر طبرانی اور بزار نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حافظ ہیثمی فرماتے ہیں۔ اس حدیث کے رواۃ بخاری کے رواۃ ہیں۔ (فیض القدیر ج ۶ ص ۳۰۰)

ارباب لغت کہتے ہیں ''اخ واخوۃ صار لہ اخا و صدیقا'' دوست اور بھائی کے لئے ایسا کہا جاتا ہے اور کہتے ہیں ''الاخ والاخو من جمعک و ایاہ صلب او بطن'' ایک صلب پشت میں یا بطن میں رحم میں جو اکٹھے ہوتے ہیں ان کے لئے اخ اور اخو کہا جاتا ہے۔

علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضور نے نیند کو موت کی بہن اس لئے فرمایا کہ نیند میں بھی موت کی طرح عمل منقطع ہو جاتا ہے۔ آپ نے پڑھ لیا ہے کہ قرآن شریف میں اور حدیث شریف میں بھی نینداور موت کو امساک فرمایا گیا ہے کہ نیند میں بھی موت کی طرح امساک روح ہوتا ہے اور یہی انقطاع عمل ہے اور دونوں کو کتاب وسنت نے ایک مسلک میں بیان فرمایا اور دونوں میں ایک قسم کا امساک اور انقطاع عمل ہے۔ اس لئے جس کی جس قسم کی بہن ہے اس کی دوسری بہن بھی اس قسم کی ہے جس کی نیند میں بیداری کا ازالہ ہے تو اس کی دوسری بہن میں بھی اس کی حیات کا انقطاع ہے اور جس کی نیند میں بیداری کا استتار ہے۔ اس کی موت میں بھی استتار حیات ہے اور اہل جنت نہیں مریں گے۔ اس لئے وہ سوئیں گے نہیں یا اہل جنت سوتے نہیں۔ اس لئے وہ مریں گے بھی نہیں۔ اہل جنت میں ایک بہن نہیں ہے تو دوسری بھی وارد نہیں ہوتی اور اگر اہل جنت کی موت ہوتی تو ان کی حیات کا انقطاع یا ازالہ ضروری ہوتا۔

اس طرح اگر ان کو نیند آتی تو ان کی بیداری کا بھی ضروری ازالہ ہوتا جیسے کہ دنیا میں ان کی نینداور موت کی یہ کیفیت معلوم اور یقینی تھی۔ اگر نیند میں بیداری کا ازالہ ہوتا ہے اور موت میں حیات باقی رہتی ہے یا نیند میں بیداری کا

استتار ہوتا ہے اور موت میں حیات کا ازالہ ہوتا ہے تو پھر نیند اور موت باہمیں نقیض نہیں ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ استتار بقاء کو چاہتا ہے اور ازالہ فناء کا تقاضا کرتا ہے تو پھر موت اور حیات کی طرح امساک اور ارسال کی طرح نیند اور موت دو متضاد ثابت ہوتے ہیں باہمیں باقی نہیں رہتی ہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی نیند میں چونکہ صرف بیداری کا استتار ثابت تو حضور ﷺ کی موت میں بھی صرف حیات کا استتار لازم ہے اور اس کی تائید حضور ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا "انا معشر الانبیاء تنبت اجسادنا علی ارواح اهل الجنت" ہم گروہ انبیاء کے اجساد کی ساخت ایسی ہے جیسے اہل جنت کے ارواح کی ساخت جو کچھ اس سے نکلتا ہے زمین اس کو نگل جاتی ہے۔

(خصائص کبریٰ ج اوّل ص ۷۰)

بیہقی رحمہ اللہ نے ابن علوان کے طریقہ سے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے لیکن حافظ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "کلا لیس کما قال" ہرگز ایسا نہیں ہے جیسا کہ بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے اور ابو نعیم، حاکم، دار قطنی اور خطیب کی سند اور سات طریقوں سے اس حدیث کو خصائص میں روایت کی ہے۔ کثرت طرق حدیث کی قوت کی ہدایت کرتی ہے اور اس کے بعض طرق میں بخاری کے رواۃ اور ثقہ صالح رواۃ ہیں اور ابن دحیہ نے بعض سند کے متعلق کہا ہے کہ یہ سند ثابت ہے اور محدثین کی زبان میں سند ثابت صحیح سند یا اس سے کچھ اوپر ہوتی ہے۔

آگے یہ بحث آتی ہے حدیث کا معنی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجساد مقدسہ اہل جنت کی ارواح کی ساخت پر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ امت کے اہل رشد و صلاح ہی اہل جنت ہیں اور نیز آپ جانتے ہیں کہ موت نفس کو عارض ہوتی ہے اور "کل نفس ذائقة الموت (العنکبوت: ۵۷) وما کان لنفس ان تموت الا باذن الله" (آل عمران: ۱۴۵) دلیل ہے کہ موت کا موصوف نفس اور جان ہے اور امت کے صلحاء دنیا میں سوتے تھے اور ان کو موت آتی ہے۔ صلحاء کی ارواح اور نفوس کا نیند میں اور موت میں امساک ہوا۔ نیند میں ان کا امساک بیداری کے ازالہ کی حد پر تھا اور موت میں ان کا امساک حیات کے انقطاع کے مقام پر تھا اور اب جنت میں نہ ان کے لئے نیند ہے اور نہ موت۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نہ ان کی بیداری ختم کی جاتی ہے اور نہ ان کی زندگی، بلکہ ہمیشہ بیدار رہیں گے اور ہمیشہ زندہ۔

اسی طرح کا حال انبیاء علیہم السلام کے اجساد کا ہے، اجساد کی نیند میں بیداری بند نہیں ہوتی بلکہ نیند کے پردہ کے پیچھے مستور ہو جاتی ہے۔ اجساد انبیاء کو ارواح اہل جنت کی ساخت میں حضور ﷺ کی حدیث میں مذکور ہونا موت کے وقت استتار حیات اور نیند کے وقت استتار حیات بتلانے پر بلیغ کنایہ ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجساد جنت میں حالت راہنہ میں اہل جنت کی ارواح کی ساخت پر ہیں تو یہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اہل جنت کی ارواح جنت میں نہ سوتی ہیں اور نہ مرتی ہیں۔ جیسا کہ سابق حدیث میں مذکور ہوا اور انبیاء کے اجساد سوتے بھی تھے اور ان کو موت بھی عارض ہوتی ہے اور اگر یہی مذکورہ مراد صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اہل جنت کی ارواح کی طرح انبیاء کے اجساد نہ سوتے ہیں اور نہ مرتے ہیں۔ اگر دنیا میں نہ سونا اور نہ مرنا مراد ہے تو یہ خلاف واقع ہے اور اگر برزخ میں نہ مرنا اور نہ سونا مراد ہے تو یہ ہماری مراد ہے۔ مگر منکرین حیات اس کا انکار کرتے ہیں۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم!

یہ تمام تفصیل اس لئے کی گئی کہ قرآن شریف میں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں جو حضور ﷺ کی نسبت لفظ مات فرمایا گیا۔ اس کے معنی مراد یہ ہے کہ جو امت کے محدثین اور فقہاء نے لکھا ہے اور نصوص کے معانی دوسروں کے مقابلہ پر فقہاء امت بہت زیادہ جانتے ہیں۔

جامع ترمذی باب غسل المیت میں ام عطیہ کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ام عطیہ کی حدیث میں میت کو تین یا پانچ یا زیادہ بار دھونے پانی ڈالنے کا حکم اگر چہ دیا گیا ہے لیکن یہ توقیت نہیں ہے۔ جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی صرف اس قدر ہے کہ صفائی میں احتیاط کے ساتھ مبالغہ کیا جائے۔ لیکن تین یا پانچ کی توقیت مراد نہیں۔ اگر تین سے کم میں بھی خوب صفائی ہو گئی ہے تو یہ کافی ہے اور ان فقہاء کا یہ کہنا حدیث کے معنی مراد اس لئے ہے کہ فقہاء ہی حدیث کے معانی زیادہ جانتے ہیں۔ (ترمذی ج ۱ اول ص ۱۱۸)

اور منکرین حیات کے انکار کا دوسرا رخ کہ کسی نص سے حضور ﷺ کی جسمانی حیات برزخ میں ثابت نہیں ہوتی ہے۔ آگے اس پہلو پر کلام کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے محدثین اور فقہاء کا نظریہ جو حضور ﷺ کی موت اور حیات کے متعلق ہے۔ پڑھ لیجئے تاکہ آپ آسانی سے یہ سمجھ سکیں کہ عالم برزخ میں حضور ﷺ کی کس قسم کی حیات کا امت کے علماء محدثین اور فقہاء کو یقین ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ابوعبداللہ قرطبی کہتے ہیں ہمارے شیخ ابن بن عمرو نے خوب کہا ہے اور اس سے مذکورہ اشکال رفع ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موت عدم محض نہیں ہے بلکہ موت یہ ہے کہ ایک حال سے دوسرے حال میں پہنچ جائے اور اس کے قرائن اور دلائل یہ ہیں کہ شہداء قتل اور موت کے بعد زندہ ہیں۔ ان کو کھانے کے لئے ملتا ہے اور مرزوق ہونا دنیا کی زندگی کی صفت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ برزخ میں دنیا کی زندگی کی طرح شہداء کے اجساد زندہ ہیں اور جب عالم برزخ میں شہداء کی زندگی کا یہ حال ہے تو انبیاء جن کا مقام اور رتبہ شہداء سے بدر جہا زیادہ ہے اور اس سے بھی زیادہ ہے کہ غیر شہداء سے شہداء کا فوق درجہ ہے۔ اس لئے عالم برزخ میں انبیاء کے اجساد کا انبیاء کو زیادہ حق اور اس جسم کی حیات کا سب سے مقدم حق انبیاء کو ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ثابت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا انبیاء کے اجساد کو زمین نہیں کھائے گی اور حضور ﷺ بیت المقدس اور آسمانوں میں معراج کی رات انبیاء سے عموماً اور خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملے ہیں اور حضور ﷺ نے نے بتایا کہ جو بھی حضور ﷺ پر سلام پڑھتا ہے تو حضور ﷺ اس کا جواب دیتے ہیں۔ ان مذکورہ حدیثوں سے قطعی ثابت اور یقین ہوتا ہے کہ انبیاء کی موت صرف اس قدر ہے کہ ہم سے پوشیدہ کر دیئے گئے ہیں۔ ہم ان کو نہیں جانتے اگر چہ وہ زندہ موجود ہیں۔ جیسا کہ ملائکۃ اللہ زندہ موجود ہیں۔ مگر ہم ان کو نہیں دیکھتے ہیں۔ (کتاب الروح ص ۵۴)

اور (زرقانی شرح مواہب ج ۵ ص ۳۳۴، اور انباہ الاذکیاء ص ۷) پر اس تقریر میں اتنا اور مذکور ہے کہ ہماری نوع میں کوئی فرد ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ مگر یہ کہ اللہ اپنے کسی ولی کو بطور کرامت اور خرق عادت بیداری کی حالت میں اس دولت و نعمت سے خصوصیت کے ساتھ سرفراز فرمائے۔

حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں: کہ واقعہ حرہ کے دنوں میں میرے سوا مسجد نبوی میں کوئی دوسرا نہیں تھا اور مسجد نبوی میں نہ اذان ہوتی تھی اور نہ اقامت اور مجھے نماز کا وقت اس لئے معلوم ہو جاتا تھا کہ آرام گاہ نبوت سے میں اذان کو سنتا تھا۔ (التعلیقات علی حیات الانبیاء للبیہقی، سنن دارمی ص ۴۴)

آرام گاہ نبوت میں اذان کا دیا جانا نماز پڑھنے کے لئے تھا اور یہ نفس حیات نہیں ہے بلکہ اذان دینا حیات سے اور حیات فوق عمل اور فعل ہے۔ جسمانی حیات کے سوا اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

اور طحطاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اور جو محدہ محققین کو ثابت ہے یہ ہے کہ حضور ﷺ زندہ ہیں۔ کھاتے ہیں اور

جمع ملاذ اور عبادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حضور ﷺ کی موت کی بات صرف اتنی ہے کہ جو لوگ شریف اور بلند مقامات سے قاصر ہیں ان کی نگاہ سے در پردہ میں کئے گئے ہیں اور جو لوگ شریف مقامات کو دیکھتے ہیں ان کی نگاہ میں حضور ﷺ اب بھی ظاہر ہیں۔ (طحطاوی ص ۳۴۱)

ان حضرات محدثین اور فقہاء نے حضور ﷺ کی موت کو صرف اس قدر بتایا ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی موت عوام کی موت کی طرح نہیں ہے۔ حضور ﷺ کی زندگی عالم برزخ میں ایسی ہے کہ آپ کی قبر مبارک میں اذان ہوتی ہے اور آپ نماز پڑھتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں اور یہ افعال جسم کی حیات اور دنیا کے جسم کی حیات کے بدوں ناممکن ہے۔

سعید بن المسیب کے مذکورہ واقعہ کو سعید بن المسیب کی زبان سے ابن جوزی اس طرح نقل کرتے ہیں کہ: حضور ﷺ کی قبر مبارک سے نماز کے وقت میں اذان سنتا تھا، پھر نماز کھڑی ہو جاتی تھی تو میں آگے بڑھتا تھا پس نماز پڑھتا تھا اور میرے سوا مسجد میں دوسرا نہیں تھا۔ (وفاء الوفاء ج ا، ل ص ۱۳۴)

آرام گاہ نبوت میں نماز اور پھر جماعت کی نماز اور سعید بن المسیب آرام گاہ نبوت میں نماز کی اقتداء کرتے ہیں۔ کیا یہ روحانی اور برزخی زندگانی کے واقعات ہیں۔

حضور ﷺ کے جسمانی حیات کی پہلی دلیل

قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے ”ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون“ (آل عمران: ۱۶۹) ترجمہ: (اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مرتے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے ہیں)

آیت کی مراد یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جو مارے گئے ہیں۔ تم یہ مت سمجھو کہ وہ مردے ہیں۔ بیشک وہ مارے گئے۔ مگر اللہ نے ان کو حیات بخشی۔ تم ان کو زندہ سمجھو ان کی زندگی دائمی ہے اور ان کی زندگی ایسی ہے جس میں وہ کھاتے پیتے ہیں اور اللہ کے یہاں ان کا بڑا درجہ اور مقام ہے اور یقیناً وہ زندہ ہیں ان کی زندگی میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ ان کے قتل فی سبیل اللہ سے تم ان کو مردہ سمجھ رہے تھے جیسا کہ عام مقتول مردہ ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قتل ہونے سے پیشتر زندگی کی طرح اللہ نے ان کو زندگی بخشی ہے اور پیشتر زندگی کی طرح وہ کھاتے پیتے ہیں۔ کھانا پینا جسم کی صفت اور لوازم جسم سے ہے۔ اس کے معنی یہ ہے کہ ان کی زندگی جسمانی ہے۔ جسمانی زندگی کے معنی یہ ہے کہ جسم اور روح کا تعلق اور اتصال جسم میں تدبیر و تصرف کا تعلق اور اتصال ہے اور کھانا اس قسم کے تعلق کا اثر اور ثمرہ ہے۔ شہداء فی سبیل اللہ کی زندگی نفس زندگی بھی نہیں۔ جس میں جسم اور روح کا اتصال یا تعلق تو ہوتا ہے۔ مگر حیات کے آثار اور اعمال اس میں ظاہر نہیں ہوتے کہ وہ بھی ایک قسم کی مردگی ہے۔ جیسے عام اموات مردہ ہیں مگر ان کے ارواح کو ان کے اجسام کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ اس کی تفصیل پہلے کر چکا ہوں۔

سید آلوسی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: شہداء کی حیات پر سورۃ بقرہ میں پورا کلام کر چکا ہوں۔ یہاں اس قدر یاد رکھنا چاہئے کہ شہداء کی حیات اور رزق کو روحانی زندگی اور روحانی رزق بتلانا اور سمجھنا کہ ان کی ارواح افلاک اور کواکب سے متعلق ہوتے ہیں اور اس میں لذت حاصل کرتے ہیں اور کمال بڑھاتے ہیں۔ یہ ایسے

لوگوں کا کہنا اور سمجھنا ہو سکتا ہے۔ جن کے کانوں میں صحیح اور صریح روایات اور اخبار کی آواز نہیں پڑی ہے۔ بلکہ ایسے لوگ شریعت غراء کی لذت سے آشنا نہیں ہیں اور ان کو محجۃ بیضاء کی راہ نہیں دکھائی گئی ہے۔ اللہ کی قسم ہے کہ شہداء کا حال اور ان کی زندگی روحانی رزق اور زندگی سے بالاتر اور برتر ہے۔ (روح المعانی ج ۴)

جب قرآن شریف کی مذکورہ آیت میں شہداء کی جسمانی حیات کو ذکر کیا گیا ہے اور علماء کو شہداء کی جسمانی حیات کا اعتراف ہے تو کیا قرآن شریف کی مذکورہ آیت کے عموم یا مفہوم موافق میں نبی کریم ﷺ داخل ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ حضور ﷺ کی تمام زندگی اور زندگی کا ایک ایک واقعہ رشد و ہدایت، درس و تبلیغ، صلح و جنگ، دوستی و دشمنی، عبادات اور معاملات، حیات و ممات تمام اللہ کے لئے تھے اور اللہ کی راہ میں ہیں "ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین لا شریک له و بذالک امرت و انا اول المسلمین" (الانعام: ۱۶۲) ترجمہ (میری نماز اور حج اور جینا اور مرنا ایک اللہ کے لئے ہے۔ اس کا شریک کوئی نہیں اسی کا میں امر دیا گیا ہوں اور سب سے پہلے حکم بردار ہوں)

حضور ﷺ کا صدقہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور غیر صحابہ امت کے شہداء کو اللہ کے یہاں اونچا درجہ اور بلند مقام ملتا ہے۔ کون سا موقع ایسا آیا ہے جن کے حق میں قرآن شریف کی وہ آیت اترتی ہے اور جن کو اللہ کی طرف سے ابدی حیات کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور حضور رسالت مآب ﷺ اس میں ان جانفروش صحابہ رضی اللہ عنہم سے آگے آگے نہ تھے۔ جن کو شہادت کی یہ سعادت ملی۔ وہ بھی حضور ﷺ کی رفاقت اور حضور ﷺ کی دعوت جہاد پر لبیک کہنے کا انعام وصلہ ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ رضاء الٰہی کے لئے جس پیغمبر علیہ السلام نے تمام رشتے ناطے چھوڑ دیئے ہیں استعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہر وقت رات دن کے خویشوں اور بیگانوں سے شدید سے شدید درد دکھ سہا ہے۔ دین الٰہی کے دشمنوں اور نبوت کے معاندوں کے مقابلہ میں زخم کھائے۔ مغازی جن کی عمر کا بڑا حصہ ہے۔ شہادت کی عزیت اور فضیلت میں ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور امت کے شہداء سے پیچھے ہیں۔ جن کو اس کے سامنے قرآن شریف نے بولنے اور اس کی آواز سے آواز اونچی کرنے کو منع فرمایا تھا اور دنیا میں جس کے آگے کسی کا قدم نہیں اٹھتا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس منفعت میں حضور ﷺ فداہ ابی و امی سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ کلا ایسا بھی کوئی بدنصیب ہے جو اس کا دعویٰ اور یقین کرے۔

پہلے صفحات میں لکھ کر آیا ہوں کہ خیبر کے دن یہودیہ عورت نے حضور ﷺ کو زہر کھلایا تھا اور بخاری کی روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: عائشہ ہمیشہ اس کی تکلیف اٹھاتا رہا ہوں اور اب تو اس نے میری شہ رگ کر کاٹ دیا۔

کیا حضور ﷺ کے اس بیان میں زہر کی دائم اور شدت تکلیف سے آپ کو تسلی نہیں ہوتی ہے کہ تلوار کا قتل اس طویل تکلیف قتل سے دون اور مختصر ہے۔ شعبی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ امام حسن کو زہر دیا گیا تھا اور امام حسین قتل کر دیئے گئے۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۹)

اور حافظ ابن عبد البر امام حسن کے ترجمہ میں استیعاب میں کہتے ہیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ سے کہا: میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ زہر دیا گیا ہوں لیکن اب تو میری انتڑیوں کو کوٹ دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا گیا اور اسی سے آپ شہید ہوئے ہیں اور حافظ ابن حجر اصابہ میں امام حسن رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ اہل جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ شعبی نے قسم کھا کر کہا ہے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زہر دیا گیا اور عمر رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۹)

حضور ﷺ نے فرمایا: ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اہل جنت کے بوڑھوں کے سردار ہیں۔ (جامع صغیر ج اول ص ۸۸) مگر انبیاء و مرسلین امام حسین امام حسن رضی اللہ عنہما سے اور حضرت عمر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما سے حسن شہادت کی فضیلت میں آگے نہیں بڑھے۔ زہر کی موت اور قتل کی موت دونوں شہادت ہیں۔

اس لئے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے پسند ہے کہ نو مرتبہ قسم کھا کر یہ کہہ دوں کہ حضور رسالت مآب ﷺ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں۔ (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۸)

اور مسند احمد نیا ایڈیشن (ص ۲۲۰ و ۳۳۴) اور مسند احمد میں عبدالرزاق کے طریقہ میں یہ بھی ہے کہ اعمش نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول ابراہیم نخعی سے ذکر کیا تو ابراہیم نے کہا صحابہ ایسا سمجھتے تھے۔ حضور ﷺ کو اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہود نے زہر دیا تھا۔ حضور رسالت مآب ﷺ کی شہادت فی سبیل اللہ یقینی ہے اور قرآن شریف اپنے عموم اور مفہوم موافق دونوں میں حضور ﷺ کی جسمانی حیات کا اور برزخ میں کھانے پینے کا اعلان کرتا ہے۔ اگر ابن ماجہ کی یہ حدیث کہ حضور ﷺ اپنے مبارک قبر میں زندہ ہیں اور کھاتے پیتے ہیں، منقطع ہے تو اس کا انقطاع کیا ضرر دیتا ہے۔ جب اس کا مضمون قرآن کے مفہوم کے موافق میں مذکور ہے اور بیشک حضور ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح شہید نہیں بلکہ صدیق فرمایا ہے۔

مگر اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضور ﷺ زہر کے قتل کو شہادت نہیں جانتے تھے۔ بلکہ وہ مقام مدح ہے اور صدیقیت شہادت سے بڑھ کر مقام ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اسی ترتیب سے مذکور ہوا ہے۔ پہلے صفحات میں تفصیل کے ساتھ کتاب وسنت اور صحابہ کے آثار سے ظاہر کر چکا ہوں کہ موت فی سبیل اللہ اور قتل فی سبیل اللہ دونوں کا اجراء کیا ہے اور دونوں شہادت ہیں اور یہ کہ مقتول فی سبیل اللہ اور مائت فی سبیل اللہ دونوں مرزوق ہیں۔

حافظ سخاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حضور ﷺ کی حیات کے دلائل میں سے ایک دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ''ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون'' (آل عمران: ۱۶۹) اس لئے کہ حضور ﷺ کو بہ اتم وجوہ شہادت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ سید الشہداء ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے صاف صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ حضور ﷺ شہادت کی موت فوت ہوگئے ہیں۔ (القول البدیع ص ۱۲۷)

اور حیات الانبیاء بیہقی کے تعلیقات میں محمد بن محمد الحافی الیوسنوی لکھتے ہیں: انبیاء کی حیات بعد الوفات کی اس آیت ''ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم'' میں مفہوم موافق میں قرآن شریف رہنمائی کرتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام عالم برزخ میں زندہ ہیں۔ اس لئے کہ عالم برزخ میں زندگی منقبت ہے اور انبیاء اس منقبت کے شہداء سے زیادہ حق دار ہیں اور نیز یہ آیت اپنے عموم لفظ میں حضور ﷺ کی حیات کی خصوصیت کے ساتھ بھی رہنمائی کرتی ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کے لئے شہادت اور نبوت دونوں وصفوں کو جمع فرما دیا ہے جیسا کہ یہ صحیح ثابت ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں: بہت کم نبی گزرے ہیں مگر حق تعالیٰ نے ان کی نبوت کے ساتھ وصف شہادت کو بھی اکٹھا کیا ہے۔ (حیات الانبیاء ص ۵)

شہداء کی فہرست میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ روشن حضور ﷺ کا نام نامی ہے۔ اس لئے مذکورہ آیت میں سب سے مقدم حضور ﷺ کی جسمانی حیات کی خبر دی گئی ہے۔ حضور ﷺ کو مردہ کہنے اور سمجھنے سے ہم روک دیئے گئے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی حضور ﷺ کے جسم مقدس کو آرام گاہ نبوت میں مردہ بے جان گمان کرتا ہے تو

یہ قرآن شریف کی نہی کے خلاف اس کی باغیانہ جسارت ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی جسمانی حیات کی دوسری دلیل

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ (حیات الانبیاء، انباہ الاذکیاء)

اور علامہ مناوی رحمہ اللہ جامع صغیر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث صحیح ہے اور انبیا اپنی زندگی میں شہداء کی زندگی سے افضل ہیں اور قرآن شریف میں مذکور ہے کہ شہداء عند ربہم زندہ ہیں۔ عند ربہم کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ عالم برزخ میں ان کی زندگی ہماری دنیا کی زندگی کی طرح ہمارے سامنے اور ظاہر نہیں ہے کہ عالم برزخ میں انبیاء کی زندگی اگرچہ جسمانی ہے لیکن ملائکہ کی زندگی کی طرح غیر ظاہر ہے اور انبیاء زندہ ہیں۔ اس لئے ان کا مال ترکہ نہیں ہوتا۔ (فیض القدیر ج ۳ ص ۱۸۴)

حافظ نور الدین ہیثمی لکھتے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ابو یعلی اور بزاز نے بھی روایت کیا ہے اور ابو یعلی کے رجال ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: بیہقی رحمہ اللہ نے انبیاء کی قبور میں حیات پر ایک لطیف کتاب لکھی ہے۔ اس میں حضرت انس کی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ انبیاء زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث یحییٰ بن ابی کثیر عن المسلم بن سعید عن الحجاج عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ کے طریقہ سے تخریج کی ہے۔ یحییٰ بن کثیر صحیح بخاری کے رجال میں سے ہے اور مسلم بن سعید کی توثیق امام احمد اور ابن حبان نے کی ہے اور حجاج کی توثیق امام احمد اور ابن معین نے کی ہے اور ابو یعلی اور بزار نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

اور بیہقی نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے شاہد وہ حدیث ہے جس کو امام مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ حضور فرماتے ہیں: میں سرخ ٹیلے کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام پر گزرا اور وہ کھڑے ہوئے اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اگر اعتراض ہو کہ یہ تو صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال بیان کیا ہے۔ باقی انبیاء کا حال اس میں مذکور نہیں تو ہم کہیں گے کہ مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بھی روایت کی ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اپنے آپ کو انبیاء کی جماعت میں دیکھا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کھڑے ہوئے نماز پڑھتے ہیں اور عروہ بن مسعود سے شکل و شباہت میں ملتے جلتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کھڑے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سب سے زیادہ مجھے مشابہت تھی۔ نماز کا وقت ہوا۔ میں نے ان کو نماز پڑھائی۔ پھر اکٹھے کئے گئے بیت المقدس میں۔

اور ابی ذر رضی اللہ عنہ اور مالک بن صعصعہ کی حدیث میں ہے کہ حضور انبیاء علیہم السلام سے آسمانوں پر ملے ہیں اور یہ تمام احادیث صحیح ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، پھر حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام آسمانوں پر اٹھائے گئے اور ان سے حضور ﷺ کی ملاقات آسمانوں پر ہوئی۔ پھر بیت المقدس میں اکٹھے کئے گئے اور نماز کا وقت ہوا تو حضور ﷺ نے ان کو نماز پڑھائی۔ بیہقی کہتے ہیں مختلف اوقات اور مختلف امکنہ میں انبیاء کی نماز عقلاً جائز ہے اور نقل صحیح اس کی خبر دیتی ہے اور یہ ان کی حیات کی دلیل ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۷۸)

حافظ نے بیہقی کی تحریر کا جو حوالہ دیا ہے وہ حیات الانبیاء کے (ص ۸) پر مذکور ہے امام بیہقی نے جو صحیح مسلم کی روایات کا حوالہ دیا ہے۔ وہ صحیح مسلم (باب الاسراء ج اوّل میں ص ۳۳۴) اور (کتاب الفضائل ج ۲ ص ۲۶۸) میں مذکور ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ انبیاء زندہ ہیں اور اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں اور صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہی آپ نے قبر میں نماز پڑھتے نہیں دیکھا بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام نے بیت المقدس میں نماز پڑھی اور ان کو نماز پڑھانے والے سید الرسل، امام الانبیاء حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بیت المقدس میں ان کی نماز کا اور قبروں میں ان کی نماز کا عقل انکار نہیں کرتی۔ بلکہ جائز جانتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ان کا ثبوت ہوتا ہے اور یہ ان کی حیات کی دلیل ہے۔ اس لئے ہم جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام وفات کے بعد بھی زندہ ہیں اور بیت المقدس اور آسمانوں میں انبیاء کی یہ ملاقات جسمانی زندوں کی سی ملاقات تھی۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بجسد عنصری تشریف لے گئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بجسد عنصری اوپر آسمانوں سے تشریف لائے تھے اور یہ ایسی ملاقات تھی جس میں ایسے انبیاء بھی شامل تھے جو پہلے وفات پا چکے ہیں اور وہ بھی جو ابھی زندہ تھے اور اب تک ان کی حیات مستمر چلی آرہی ہے۔ جیسے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان کے مناسب یہی ہے کہ ان کی ملاقات جسمانی تھی اور انبیاء اپنے اجسام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال اور ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔ روحانی ملاقات اور مثالی ملاقات کا دعویٰ صرف تکلف ہے۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ اور کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔

اگرچہ یہ احتمال ہے کہ انبیاء کی ملاقات صرف روحانی ہے۔ مگر یہ احتمال بھی ہے کہ انبیاء کی ملاقات جسمانی ہے۔ مگر اسریٰ کے واقعہ میں جو حالات بیان کئے گئے وہ یا تو روحانی ملاقات پر چسپاں نہیں ہوتے ہیں یا جسمانی ملاقات پر زیادہ اور مقدم چسپاں ہوتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اسریٰ کے واقعہ کے واقع ہونے میں حق تعالیٰ نے یہ حکمت اور علت ظاہر اور بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ حرم مکہ سے مسجد اقصیٰ تک اپنے محبوب ترین بندہ اس لئے لے گیا کہ حق تعالیٰ نے یہ چاہا تھا کہ اپنی لامحدود قدرت کے عظیم الشان نشان اور قدرت کے حکیمانہ عجائبات آپ کو دکھلائیں۔ ''لنریہ من آیاتنا'' تاکہ دکھلائیں اس کو اپنی قدرت کے نمونے۔ زمین اور آسمانوں کے عجائبات حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دکھائے گئے۔ انسانی قدرت کے نمونے جب ظاہر کئے جاتے ہیں تو انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اللہ کی قدرت کے نمونے جن کے اعجب الآیات اور اغرب الکائنات ہونے میں شک نہیں ہوتا ہے۔ ایسے خرق عادت فوق العادت قدرت کے نمونے اسریٰ کے واقعہ میں حضرت حق نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھلانا چاہا ہے۔

اسریٰ کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کو نماز پڑھائی، انبیاء سے ملاقات فرمائی۔ اگر یہ نماز بھی روحانی ہے اور ملاقات بھی روحانی ہے تو کیا اس روحانی نماز اور روحانی ملاقات کو اعجب الآیات واغرب الکائنات کو قدرت کے زیادہ سے زیادہ عجیب وغریب نمونے کہنا موزوں ہے یا جب کہ جسمانی نماز اور جسمانی ملاقات ہے تو اس کو قدرت کی عجیب آیات اور کائنات کا زیادہ غریب واقعہ نمونہ بتلانا زیادہ مناسب ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ کوئی اور چیز موجود ہے جسے روح کہتے ہیں۔ وہ عالم امر کی چیز ہے اور خدا کے حکم اور ارادہ سے فائض ہوتی ہے ''قل الروح من امر ربی'' آپ فرما دیجئے روح ہے میرے رب کے حکم سے اور خلق کے بالمقابل ہے ''الا لہ الخلق والامر'' اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا۔ اللہ تعالیٰ نے امر کو خلق مقابلہ پر رکھا ہے۔ امر کے معنی یہ ہے، مخلوقات کو ایک معین ومحکم نظام پر چلاتے رہنا جسے تدبیر وتصریف کہتے ہیں۔ یہ امر

ہے جیسے پیدا کرنا خلق ہے اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی یا تشریعی احکام دینا یہ امر ہے اور یہ امر الٰہی ہے۔ جیسے قرآن شریف میں لفظ کن سے تعبیر کیا گیا ہے "انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون" (یٰسین: ۸۲) ترجمہ: اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہیں کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو، وہ اسی وقت ہو جائے۔ "خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون" (آل عمران: ۵۹) ترجمہ: بنایا اس کو مٹی سے پھر کہا اس کو کہ ہو جا وہ ہو گیا) خلق وابداع کے بعد کن کا ذکر آیا ہے۔

اس کا معنی یہ ہے کہ خلق کے بعد تدبیر و تصریف وغیرہ کے لئے لفظ کن سے خطاب ہوتا ہے اور یہ جنس کلام سے ہے۔ اللہ کی قدیم صفت ہے۔ چونکہ قرآن شریف میں روح کے ساتھ اکثر لفظ امر آتا ہے "روحا من امرنا (الشوریٰ: ۵۲) یلقی الروح من امرہ" (المومن: ۱۵) اور امر سے مراد کن کا کلمہ ہے۔ یعنی وہ کلام انشائی جس سے مخلوقات کی تدبیر و تصریف اس طریقہ پر کی جائے جس پر غرض ایجاد و تکوین مرتب ہو۔ غرض یہ کہ روح خواہ جوہر مجرد یا جسم ہوا امر ربی کا مظہر ہے اور مخلوقات میں اس طرح تدبیر و تصرف کرتی ہے۔ جس سے اس کی ایجاد اور خلق کا منشاء پورا ہوتا ہے اور یہ مخلوق میں حلول اور جسم میں دخول کئے بغیر ناممکن ہے۔ بجلی کا کرنٹ اس وقت چھوڑ دیا جاتا ہے جب مشین کے کل پرزوں کو جوڑ کر مشین کو فٹ کیا جائے۔ ورنہ بجلی کے کرنٹ چھوڑنے سے مشین چالو نہیں ہوگی اور نہ وہ کام حاصل ہو سکتے ہیں جو مشین چالو ہونے کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔

اسی طرح آپ سمجھ لیجئے کہ اجساد اس مشین کی مانند ہیں جس کے کل پرزے ٹھیک اندازہ پر اور جوڑے ہوئے فٹ ہیں تو جو کام اس سے لینا ہے اس کام کے لینے یا اس میں لگانے کے لئے امر الٰہی کی بجلی چھوڑ دی جاتی ہے اور حسب منشاء ان اجسام میں تدبیر و تصرف ہوتا ہے اور جو کرنٹ مشین کی طرف سے چھوڑا جاتا ہے وہ مشین سے اس کی بناوٹ اور استعداد کے موافق کام لیتا ہے اور اس کی ساخت کے مناسب حرکت دیتا ہے بلکہ جن لیمپوں اور قمقموں میں وہ بجلی پہنچتی ہے ان ہی کے مناسب رنگ و ہیئت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن اگر لیمپ اور قمقمے نہیں ہیں۔ مشین نہیں ہے تو صرف کرنٹ چھوڑنے سے روشنی اور مشین کے کاموں اور مقاصد کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر بیت المقدس میں اور آسمانوں میں انبیاء علیہم السلام کے اجسام نہیں تھے تو صرف روح امر ربی سے حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا، حضرت آدم کو دیکھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا وغیرہ۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ اور ان حضرات انبیاء کی نمازوں کا خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجسام میں امر ربی کی روح کی روشنی ہو رہی ہے تو حضور ﷺ نے ان حضرات انبیاء کو ان کی صورتوں اور ہیئت میں پہچانا ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجسام میں امر ربی روح کا کرنٹ پہنچ رہا ہے تو ان کو حضور ﷺ سے ہم کلامی کا موقعہ مل گیا اور ذیل کے واقعات صادق آ سکتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ابی عبیدہ کی روایت میں یہ ہے: حضور ﷺ فرماتے ہیں میں بیت المقدس میں داخل ہوا میں نے انبیاء کو پہچانا کوئی کھڑا ہے اور کوئی رکوع میں ہے اور کوئی سجدہ میں ہے۔ پھر جماعت کھڑی ہو گئی۔ میں نے ان کو نماز پڑھائی۔ حضرت انس کی روایت میں یہ ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں میں تھوڑی دیر ٹھہرا حتیٰ کہ بہت لوگ جمع ہو گئے۔ پھر مؤذن نے اذان دی۔ پس جماعت کھڑی ہو گئی اور ہم صفوں میں کھڑے ہوئے انتظار کرتے تھے کہ جماعت کون پڑھائے۔ جبرائیل نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آگے بڑھایا اور میں نے ان کو نماز پڑھائی۔ الخ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۶۴ باب المعراج)

اور صحیح بخاری باب المعراج میں ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: حضرت آدم نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح اور حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ نے مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح اور اسی طرح حضرت ادریس، حضرت موسیٰ اور حضرت یوسف علیہم السلام نے بالاخ الصالح والنبی الصالح فرمایا۔

یہ تمام احوال انبیاء کے اجسام کے ہیں جن میں رکوع اور سجدہ اذان ونماز سلام کے جواب اور اظہار مسرت کی تدبیر وتصریف کے لئے امر الٰہی روح کارفرما ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کے اجساد اپنی اپنی قبروں میں ہیں تو آسمانوں پر ان کے اجساد کو حضور ﷺ نے کیسے دیکھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کی ارواح ان کے اجساد کی صورتوں میں متشکل ہوگئی تھیں یا یہ کہ ان کے اجساد حضور ﷺ کی تشریف وتکریم میں حاضر کئے گئے تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے "فبعث لہ آدم فمن دونہ من الانبیا" ترجمہ: حضور ﷺ کی تکریم وتشریف کے لئے حضرت آدم اور آپ کے سوا دوسرے انبیاء علیہم السلام اٹھائے گئے اور بھیجے گئے تھے۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۶۶)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اہل علم کو اختلاف ہے کہ حضور ﷺ کی ملاقات کے لئے اسریٰ کی رات انبیاء کو اجساد میں پہنچا دیا گیا تھا یا ان کی ارواح ان کے اجساد میں منتقل ہوگئی تھیں۔ ابوالوفاء ابن عقیل نے ایسا کہا ہے اور ہمارے بعض مشائخ نے پہلی بات کو پسند فرمایا ہے۔

اور ان کی دلیل مسلم شریف کی یہ حدیث ہے: حضور ﷺ نے فرمایا میں نے اسریٰ کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو میں نے دیکھا کہ کھڑے ہوتے نماز پڑھتے ہیں۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیت المقدس پہنچا دیئے گئے۔ جب حضور ﷺ آپ پر گزرے ہیں۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۶۸)

بعض حضرات منکرین حیات کو انبیاء کی قبروں سے مسجد اقصیٰ اور آسمانوں پر پہنچا دینے سے تعجب ہوتا ہے اور کسی نص کے خلاف سمجھتے ہوئے انکار کرتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ اسریٰ کے واقعہ کو مستبعد سمجھتے ہوئے ابوجہل نے اس کا انکار کیا تھا اور قریش کو استبعاد تھا تو حضور ﷺ کو جھٹلایا۔ بخاری حدیث اسراء میں روایت کرتے ہیں قریش نے مجھے جھٹلایا۔ حق تعالیٰ نے حجاب اٹھایا اور میں دیکھ رہا تھا قریش جو مجھے پوچھتے تھے۔ میں ان کو بتاتا تھا۔ امام احمد اور بزار نے بسند حسن روایت کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا۔ اسریٰ کی رات کے صبح مکہ معظمہ میں ابوجہل میرے پاس سے گزرا اور کہا کہ کوئی نئی بات ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں رات بیت المقدس پہنچایا گیا تھا۔ ابوجہل نے کہا پھر صبح یہاں ہیں۔ آپ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! ابوجہل نے کہا اگر میں آپ کی قوم کو بلاؤں تو آپ ان کے سامنے بھی ایسا ہی فرمائیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! ابوجہل نے مجلس بلائی اور حضور ﷺ نے ان کے سامنے واقعہ بیان فرمادیا۔ کسی نے تالی بجائی اور کسی نے تعجب میں اپنا سر پکڑا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۵۸)

کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا اور قرب قیامت تک وہاں رکھنا "ولکم فی الارض مستقر" کے خلاف اور مستبعد ہے اور قرب قیامت سے پیشتر اسریٰ کی رات اپنے مقر سے بیت المقدس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اتارنے پر تعجب نہیں ہوتا ہے۔ کیا اس کا بھی انکار کرنا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے ایسا چاہا تھا تو اس کے سامنے کوئی ضابطہ ایسا نہیں ہے۔ جس نے اللہ کی قدرت کو محدود کردیا ہے اور اس کے ارادہ کو روک دیا ہے یا حق تعالیٰ آپ کے ہوئی کے تقاضا سے مجبور ہوسکتا ہے۔

امام بیہقی (حیات الانبیاء ص ۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں تمام دوسرے زندہ انسانوں کی طرح ہیں۔ جہاں بھی اللہ تعالیٰ ان کو اتارتے ہیں وہاں پہنچتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے روایت کیا ہے کہ معراج کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیت المقدس میں دیکھا۔ پھر آسمانوں پر ان سب حضرات انبیاء علیہم السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ''فعال لما یرید'' ہے اور انبیاء سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ملاقات بیداری میں تھی اور جسمانی تھی اور انبیاء کا یہ سیر وسفر بھی عام زندہ انسانوں کی سیر وسفر کی طرح تھا۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ عالم برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیات دنیا کی حیات کی طرح جسمانی ہے اور یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اسریٰ اور معراج کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات میں ایسے انبیاء بھی شامل ہیں جو پہلے دنیا کی زندگی میں وفات پا چکے ہیں اور ایسے بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے ابھی وفات نہیں پائی۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

اور امام بیہقی رحمہ اللہ کے بیان میں مذکور ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام گھنگر بال والے اور قبیلہ شنوءۃ کے آدمیوں کے رنگ ڈھنگ پر تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام عروۃ بن مسعود سے شکل وصورت میں ملتے جلتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ مشابہ ہیں۔ امام بیہقی اس تفصیل کے بعد لکھتے ہیں۔ ان سب میں ان حضرات انبیاء کی حیات کی دلیل ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور دوسرے حضرات انبیاء کی حیات میں فرق نہیں کرتے بلکہ ایک ہی سمجھتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات یقیناً دنیاوی اور جسمانی ثابت ہے۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کی طرح جسمانی ہے اور جسمانی مشابہت ان کے اجسام کی نسبت اور مشابہت سے بیان فرمائی گئی۔ یہ ان کی جسمانی حیات کی وجہ ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کہ انبیاء زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ انبیاء کی دنیا کی زندگی کی طرح جسمانی حیات کی دو وجوہات ہیں۔ ایک نماز کا ذکر اور دوسری وجہ قبر کی تخصیص، نماز جسمانی فعل ہے جسم کی حیات کے بغیر وہ ناممکن ہے اور انبیاء کی قبروں میں ان کے اجسام محفوظ ہیں نہ یہ کہ نعوذ باللہ انبیاء کی ارواح قبروں میں قید کر دی گئی ہیں۔ اپنی قبروں میں انبیاء کے نماز پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی قبروں میں ان کے اجسام زندہ ہیں۔ اس لئے نماز پڑھتے ہیں اور سنت کی زبان میں ارشاد ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں اس لئے وہ ایسی نماز پڑھتے ہیں جیسے کہ اس حدیث میں مذکور ہے۔ تم ایسی نماز پڑھو جیسے کہ مجھے تم نے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

مولوی صاحب کا اعتراض

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث انبیاء زندہ ہیں، اپنی اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ، علامہ مناوی رحمہ اللہ نے حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے، ہیثمی رحمہ اللہ نے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو علم حدیث کے حاذق اور ارباب بصیرت ہیں۔ اس حدیث کو صحیح بتلایا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے ایک ایک راوی کی جرح وتعدیل کے اماموں میں امام احمد ابن حبان، یحییٰ ابن معین سے توثیق نقل کی ہے۔ ان حضرات حذاق علم حدیث کی تصحیح کے بعد اس حدیث کی صحت میں شک نہیں کرنا چاہئے تھا اور ائمہ حدیث کے کسی صاحب بصیرت کی یہ تنقید کہ وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا اور بیہقی رحمہ اللہ نے تو صحیح مسلم سے اس کے شواہد بھی ذکر کئے ہیں۔ مگر مولوی اسماعیل کو اس کی

صحت میں شبہ ہے اور صرف شبہ ہی نہیں بلکہ اس کو موضوع کی حد تک لے گئے ہیں اور جب مولوی صاحب کو کہا گیا کہ مخدوم قاضی صاحب شوکانی بھی (تحفۃ الذاکرین ص ۲۸) پر لکھتے ہیں: صحیح ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ اگر چہ مولوی اسماعیل صاحب گجرانوالہ کو قاضی صاحب کا احترام ضرور ہے۔ مگر اپنی اپنی بات ہے۔ جواب میں کہتے ہیں، صحیح کا معنی ثبت ہی ہوسکتا ہے جب حدیث پر وضع کا حکم یقینی نہ ہو۔ محدثین کے نزدیک اس کی تعبیر ثبت سے ہوسکتی ہے۔ (رحیق ص ۷۴۴، مئی ۱۹۵۸ء)

مولوی صاحب اہل حدیث گروپ کے سلجھے ہوئے متین ممبر ہیں۔ مگر زبان کی آوارگی دیکھئے کہ اس حدیث کے بارے میں محدثین صحیح بمعنی ثبت کہتے ہیں۔ جس کا موضوع ہونا یقینی نہ ہو۔ خدا جانے یہ کس کی زبان کی پیداوار ہے۔ محدثین کی زبان اور اصطلاح یہ ہے کہ صحیح حدیث وہ ہے جس کی سند اوّل سے آخر تک متصل ہے۔ اس کے رواۃ عادل اور ضابط ہیں اور اس کے رواۃ میں کوئی راوی مجہول الحال اور مجہول العدالت نہیں ہے اور وہ حدیث شذوذ اور علت سے خالی ہے۔ محدثین کی زبان اور اصطلاح ایسی حدیث کو صحیح کہتی ہے۔ اگر اس گروپ کی زبان اور اصطلاح یہی ہے تو ہمیں اعتراض نہیں۔ مگر محدثین کی اصطلاح میں ایسی زبان کی مذمت کی گئی ہے۔

چنانچہ جزائری کہتے ہیں قوم نے اگر لفظ کے ایسے معنی میں استعمال کرنے پر اتفاق کرلیا ہے کہ اصل لغت میں اس لفظ کا وہ معنی نہ تھا جیسا لفظ واجب اصل لغت میں اس کا معنی ثابت ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں واجب اس فعل کا نام ہے جس کے کرنے پر ثواب اور ترک کرنے پر عقاب ہے تو قوم کے ایسے اتفاق کا نام اصطلاح ہے اور ارباب تحقیق نے کہا ہے کہ جو صاحب کسی فن میں کلام کرتا ہے تو وہ اس فن کے متعارف الفاظ کو اس فن کے متعارف معنی کے لئے استعمال کرے اور جو ایسا نہیں کرتا تو وہ یا مقتضی مقام سے جاہل ہے یا دیدہ دانستہ ابہام اور ایہام کو چاہتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی ضعیف حدیث کو حدیث حسن کہہ دیا جائے اور جب اعتراض ہوتا ہے تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس نے لغوی معنی کے اعتبار سے اس کو حسن کہا ہے تو اس کا یہ عذر مقبول نہیں ہے۔ بلکہ ایسا شخص قابل ملامت ہے، اس کو ملامت کیا جائے۔ (توجیہ النظر ص ۲۰)

محدثین کی اصطلاح میں صحیح حدیث کی تعریف پہلے لکھ دی گئی ہے۔ اگر قاضی شوکانی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کو صحیح کہتے ہیں اور صحیح کہنے سے قاضی شوکانی کی یا مولوی اسماعیل کی مراد یہ ہے کہ اس کا جعلی ہونا یقینی نہیں ہے۔ اگر چہ اس کی صحت مشکوک اور مشتبہ اور جعلی ہونا ظنی ہے تو یا یہ حضرات محدثین کی اصطلاح سے ناواقف ہیں اور یا دیدہ دانستہ فریب کرتے ہیں کہ علم حدیث میں محدثین کی اصطلاح سے ہٹ کر محدثین کے متعارف لفظ کو اس کے متعارف معنی کے علاوہ خودساختہ معنی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاضی شوکانی نے اصطلاح محدثین کے مطابق صحیح کے متعارف لفظ محدثین کے متعارف معنی کے لئے استعمال کیا ہے۔ لیکن مولوی صاحب کو مروڑ ہوا ہے اور بے دردی کے ساتھ قاضی صاحب کے صحیح معنی اور صحیح استعمال کو اپنی ہوئی کے مطابق بنانے کے لئے تحریف کیا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں صرف صحیح حدیث کو ثابت کہا جاتا ہے۔ حسن لذاتہ پر بھی محدثین ثابت کا اطلاق نہیں کرتے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کسی حدیث کے بارے میں محدثین کا یہ کہنا لایثبت اس کو لازم نہیں کرتا ہے کہ وہ حدیث جعلی ہے اس لئے کہ ثابت صرف صحیح حدیث کو شامل ہے اور ضعیف اس سے کم درجہ میں ہے اور اس کے لئے لایثبت کہا جاتا ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات للامام محمد طاہر بن علی متوفی ۹۸۶ھ)

حافظ کی مراد ظاہر ہے کہ محدثین صرف صحیح حدیث کو ثابت یا ثبت کہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے محدثین پر یہ افتراء کیا ہے کہ محدثین اس حدیث کو ثابت یا ثبت لکھتے ہیں جس کا جعلی ہونا یقینی نہ ہو۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ انبیاء میں ایک دوسرے پر فضیلت مت دیجئے۔ بخاری خصومات اور باب وفات موسیٰ میں مذکور ہے اور بیہقی (حیات الانبیاء ص ۱۳) پر اس کے متعلق کہتے ہیں۔ یہ ثابت ہے اور ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مر-با بو صیۃ رسول اللہ الخ مستدرک میں مذکور ہے اور حاکم اس کی روایت کے بعد لکھتے ہیں: ھذا حدیث صحیح ثابت۔ اس لئے کہ بخاری اور مسلم دونوں حضرات کو سعید بن سلیمان اور عباد بن العوام اور جریری سے احتجاج کرنے پر اتفاق ہے۔ جس حدیث کی صحت پر مسلم اور بخاری کو اتفاق ہے اس کو حاکم نے صحیح ثابت کہا ہے اور جس کو صرف بخاری نے روایت کیا تھا اس کو بیہقی رحمہ اللہ نے ثابت کہا ہے اور ان حضرات محدثین کی مراد یہ ہے کہ جس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے یا جس کو بخاری نے صرف روایت کیا ہے اس کی صحت میں کچھ تامل نہیں ہے۔ بلکہ اس کی صحت زیادہ قوی اور مؤکد ہے اور جو مولوی صاحب نے کہا ہے۔ اگر ثابت کہنے سے محدثین کی وہی مراد ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کو جس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے۔ وہ مشتبہ ضرور ہے۔ مگر اس کا جعلی ہونا یقینی نہیں ہے۔ اگر چہ ظن کے درجہ میں جعلی ہے۔ استغفر اللہ! کیا شان ہے غیر مقلدیت کی۔ جو چاہا لکھ مارا نہ آگے کا ڈر اور نہ حال کا خطرہ ہے۔

شبہ اور اس کا جواب

منکرین حیات حضور رسالت مآب ﷺ کی دائمی اور مستمر حیات کے خلاف ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجے گا تو اللہ میری طرف میری روح لوٹا دے گا تا کہ میں اس کے سلام کا جواب دوں۔ (ابوداؤد ج اول ص ۲۷۹)

یہ شبہ کرتے ہیں سلام بھیجنے سے پیشتر اور رد روح سے قبل حضور ﷺ کی حیات نہیں تھی۔ رد روح کے بعد حیات آتی ہے اور رد روح سلام کے بعد کیا جاتا ہے۔

جواب: اس شبہ کی یہ بنیاد کہ رد روح سے پیشتر حضور ﷺ کی حیات نہیں تھی سراسر غلط ہے اور رد روح سے پیشتر حضور ﷺ کی موت سمجھ لینا بڑی نادانی ہے۔ بخاری میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کا یہ ارشاد مذکور ہے ''ان اللہ قبض ارواحکم حین شاء ورد ھا علیکم حین شاء'' اللہ نے جس وقت چاہا تمہاری جانوں کو قبض کر لیا اور جس وقت چاہا تم کو واپس کر دیا۔ (بخاری ج ۱ ص ۸۳ باب الاذان بعد ذہاب الوقت)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ ارشاد حضور ﷺ نے اس وقت فرمایا ہے جب کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور آپ کے دوسرے رفقاء سو گئے تھے اور حضور ﷺ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے زیادہ گہری نیند سو جانے کا عذر کرتے ہوئے کہا۔ ایسی نیند میرے اوپر کبھی نہیں ڈالی گئی۔ کیا سوئے ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جب ان کی روح لوٹائی گئی تو اس لوٹانے سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور آپ کے دوسرے رفقاء صحابہ رضی اللہ عنہم استغفر اللہ! فوت ہو چکے تھے اور نعوذ باللہ وہ مردہ پڑے تھے۔ کلا ہرگز نہیں۔ رد روح سے یہ مراد نہیں کہ اس سے پیشتر مردگی تھی اور اب زندگی آ گئی۔ پہلے بھی زندگی تھی اور اب بھی زندگی ہے۔

چنانچہ بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں ''رد اللہ علیّ روحی'' جملہ حالیہ ہے اور عربیت کا قاعدہ یہ ہے کہ جب جملہ حالیہ ماضی واقع ہوتا ہے تو اس میں لفظ قد مقدر ہوتا ہے۔ جیسا قرآن شریف میں ''جاء و کم حصرت صدورھم

ای قد حصرت صدورھم "اور حدیث میں حتی تعلیل کے لئے نہیں ہے بلکہ مجرد عطف کے لئے ہے۔ حدیث کا معنی یہ ہے: جو کوئی مجھ پر سلام بھیجے گا اللہ تعالیٰ میری روح کو اس سے پہلے مجھے لوٹا چکا ہے۔ میں اس کا جواب دوں گا۔

(حیات الانبیاء ص ۱۱، الحاوی ج ۲ ص ۱۵۴)

علامہ مناوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: رد روح سے مراد رد نطق ہے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کی حیات دائمی ہے۔ کسی وقت بھی حضور ﷺ کی روح آپ سے جدا نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ صحیح ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور رد نطق حضور ﷺ کے استمرار اور دوام حیات میں ظاہر ہے۔ اس لئے کہ کوئی ایسا وقت جو حضور ﷺ پر سلام بھیجنے سے خالی گزرے۔ عادۃً محال ہے اور جس نے یہ کہا ہے کہ یہ رد سلام اس سلام پڑھنے والے کے حق میں ارشاد ہے۔ جو مواجہ شریف میں آرام گاہ نبوت کے سامنے کھڑا ہے تو اس تخصیص کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔ بہر حال اس حدیث میں رد روح سے مجاز اً رد نطق مراد ہے۔ جیسا کہ ابن الملقن اور دوسرے حضرات علماء نے کہا ہے اور مجاز کا علاقہ یہ ہے کہ نطق کے ساتھ روح کا وجود لازم ہے۔ جیسے کہ روح کے ساتھ بالفعل یا بالقوۃ نطق کا وجود لازم ہے اور رسالت مآب ﷺ عالم برزخ میں ملکوت کے احوال میں مشغول اور اس کے مشاہدہ میں دوسری طرف سے بے توجہ اور اس اشتغال اور استغراق کے حال میں آپ کا نطق بند ہے۔

اس لئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رد روح سے یہ مراد لے لینا کہ حضور ﷺ کا نطق حاضر ہو جاتا ہے۔ سلام پڑھنے والے کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ حدیث کا بہترین معنی ہے اور طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روح قدسیہ حضرت الٰہیہ میں عجیب شان میں ہوتی ہے اور جب آپ کو کسی کا سلام پہنچتا ہے تو اس حال سے اللہ تعالیٰ رد سلام کی طرف آپ کی روح کو لوٹا دیتا ہے اور آپ سلام کا جواب دے دیتے ہیں۔ جیسا کہ دنیا میں حضور ﷺ کی شان اور عادت یہ تھی کہ امت کو وحی الٰہی سے فیض پہنچاتے تھے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جو فیضان آپ پر ہوتا تھا۔ امت کو آپ فیض فرماتے تھے۔ امت پر انوار قدسیہ کے افاضہ کی شان اور حالت حضرت الٰہیہ کے اشتغال سے آپ کو مشغول اور روگرداں نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح برزخ میں حضرت الٰہیہ میں جو حضور ﷺ کی شان اور حال ہے۔ جیسے کہ دنیا میں امت پر وحی الٰہی کے فیضان کے شان اور حالت تھی۔ امت کے سلام کے جواب میں رد سلام کے فیض سے حضور ﷺ توجہ فرماتے ہیں اور امت پر فیضان سے مشغول اور روگرداں نہیں ہوتے ہیں۔ غرض دنیا برزخ آخرت تمام حالات میں حضور ﷺ کو امت پر لطف و توجہ ہوتی ہے اور کسی وقت بھی امت پر فیضان سے اشتغال نہیں فرماتے ہیں۔ (فیض القدیر ج ۵ ص ۴۶۷)

اور مولانا نانوتوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں چراغ کو جس وقت ہنڈیا میں دھر دیجئے اور اوپر سے سرپوش رکھ کر بند کر دیجئے تو وہ نور منبسط جو دور دور تک پھیلا ہوا تھا منقبض ہو کر خود شعلہ کی طرف لوٹ آتا ہے اور اس صورت میں اس شعلہ اور ان شعاعوں پر ان شعاعوں اور اس نور کا وقوع اسی طرح لازم ہے جیسے قبل از انقباض یعنی وقت انبساط در و دیوار کے اوپر مثلاً واقع تھا۔ سو اہل انصاف غور فرمائیں کہ وقت توجہ نفس الی النفس بھی انقباض مبداء انکشاف اور ارتداد مبداء انکشاف الی الاصل ہوتا ہے اور وجہ انکشاف نفس للنفس بھی ارتداد مبداء انکشاف اور انقباض مبداء انکشاف ہوتا ہے۔ اس صورت میں حاصل معنی حدیث شریف کے یہ ہوں گے کہ جب کوئی رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجتا ہے تو خداوند کریم آپ کی روح پرفتوح کو اس حالت استغراق فی ذات الٰہیہ و تجلیات الٰہیہ سے جو بوجہ محبوبیت و محبت تامہ آپ کو حاصل رہتی ہے۔ اپنے ہوش عطا فرما دیتا ہے۔ یعنی مبداء انکشاف نبوی ﷺ کو جو انبساط الی اللہ

حاصل تھا۔ مبدل بانقباض ہو جاتا ہے اور اس وقت سے ارتداد علی النفس حاصل ہوتا ہے اور اپنی ذات اور صفات اور کیفیات اور واقعات متعلقہ ذات وصفات سے اطلاع حاصل ہو جاتی ہے۔ سو چونکہ سلام امتیان بھی منجملہ وقائع متعلقہ ذات خود ہیں۔ اس لئے اس سے مطلع ہو کر بوجہ حسن اخلاق ذاتی جواب سے مشرف فرماتے ہیں اور اس حدیث میں جو لفظ رد موجود ہے وہ اس حدیث کے اس معنی پر شاہد ہے۔ (آب حیات ص ۲۲۹)

غرض یہ کہ حدیث میں رد روح سے یہ مراد نہیں ہے کہ سلام کے وقت رد روح کے بعد حضور ﷺ کو حیات دی جاتی ہے اور سلام سے پہلے اور سلام کے بعد موت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث نے تمام انبیاء کی حیات کی عالم برزخ میں خبر دی ہے اور محدثین اور فقہاء کو بالاتفاق عالم برزخ میں حضور ﷺ کی حیات کا استمرار اور دوام مسلم ہے۔ اگر چہ علماء محدثین کے جوابات متعدد ہیں۔ مگر ان سب کا مقصد ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ رد روح کے بعد قبر میں حیات اور جسمانی حیات کو جس طرح معترض تسلیم کرتا ہے۔ اسی قسم کی حیات یعنی جسمانی حیات رد روح سے پیشتر بھی حضور ﷺ کو حاصل ہے۔ جیسا کہ بیہقی اور حافظ سیوطی اور حافظ سخاوی کے سابق صفحات میں جوابات میں مذکور ہیں کہ حضور ﷺ کو عالم برزخ میں قدم رکھتے ہی روح لوٹائی گئی ہے اور جسمانی حیات دی گئی اور محدثین کے مذکورہ متعدد جوابات اور کسی قدر مختلف تعبیرات کے جوابات سے آپ یہ اندازہ کر لیجئے کہ حضور ﷺ کے جسمانی حیات کو محدثین یقینی اور حقیقت مسلمہ جانتے ہیں۔ اس لئے جس کسی محدث کو حضور ﷺ کے جسمانی حیات کے دوام اور استمرار میں کچھ وہم وشک ڈالنے والی چیز سامنے آگئی ہے تو اس نے اپنے فکر ونظر میں اس وہم اور شک کے اٹھانے کے لئے مجتہدانہ بصیرت افروز سعی فرمائی ہے اور حضور ﷺ کی حیات اور اس کے دوام واستمرار پر زور دیا ہے اور استمرار ودوام کے منافی معانی کو تکلفات وتاویلات بعیدہ کہہ کر انکار کیا ہے۔

چنانچہ علامہ مناوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں دیکھا اور یہ دیکھنا حقیقتاً بیداری میں تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں زندہ ہیں اور ایسی نماز پڑھتے ہیں جس طرح دنیا کی زندگی میں نماز پڑھتے تھے اور یہ ممکن ہے کوئی مانع اس کا نہیں ہے۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آج تک دنیا میں ہیں اور دنیا دار تعبد ہے۔ اگر چہ یہ نماز اور عبادت امر تکلیفی سے نہیں ہے۔ لیکن اکرام وتشریف کے حکم سے ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں انبیاء کو نماز محبوب تھی اور اسی کو لازم رکھا اور اسی پر فوت ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی پر باقی رکھا۔ ان کی عبادت ملائکہ کی عبادت کی طرح الہامی ہے تکلیفی نہیں ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ آدمی اس کام پر فوت ہوتا ہے جو اپنی زندگی میں کرتا تھا اور اس کام پر اٹھایا جائے گا جس پر وہ فوت ہو گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں دیکھنے اور اسی رات پھر آسمانوں پر دیکھنے میں کوئی تدافع نہیں ہے۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے مراتع اور مسارح ہیں۔ ان میں جہاں چاہتے ہیں پھرتے ہیں، پھر لوٹ کر آتے ہیں یا اس لئے کہ مفارقت بدن کے بعد انبیاء کی ارواح رفیق اعلیٰ میں ہیں اور ابدان پر ان کو اس قدر اقتدار اور تعلق ہے۔ جس سے ابدان میں تصرف اور ابدان کا تقرب ان کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور آسمانوں پر دیکھا۔

آپ سوچئے تو آپ سمجھ جائیں گے کہ اس روایت کی بحث میں جو تکلفات اور دور کی تاویلات کی گئی ہیں کہ یہ روایت منامی تمثیل یا مثالی ہے یا وحی ہے، اخبار ہے روایت عین نہیں ہے۔ ان کی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ (فیض القدیر ج ۵ ص ۵۱۹)

ف: یہ حدیث جو ابوداؤد میں ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مذکور ہے۔ اپنی صحت میں مشکوک ہے اور پہلی حدیث کی جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے مذکور ہے کہ انبیاء زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں کی ہم پایہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی صحت یقینی ہے اور محدثین نے بالاتفاق اس کو صحیح بتلایا ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث جو معترض نے ذکر کیا ہے حسن کے درجہ میں ہے جو صحیح سے قوت اور درجہ میں نیچے ہے۔

چنانچہ حافظ سخاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں امام احمد ابوداؤد، طبرانی، بیہقی نے باسنادِ حسن اس کو روایت کیا ہے۔ نووی نے اس کو صحیح کہا ہے اور اس میں نظر ہے، شبہ ہے۔ حافظ فرماتے ہیں صرف یزید بن عبداللہ بن قسیط اس حدیث کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور اس روایت میں وہ منفرد ہے اور یزید بن عبداللہ بن قسیط میں کلام ہے۔ امام مالک نے اس میں توقف کیا ہے اور فرمایا ہے لیس بذالک ایسے راوی کے منفرد روایت کی صحت پر یقین نہیں ہوسکتا ہے اور تقی ابن تیمیہ نے ذکر کیا ہے۔ اس کا کیا معنی ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں یزید بن عبداللہ بن قسیط مذکور ہے۔ گویا اس نے ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا ہے اور یزید بن عبداللہ ضعیف ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے سماع میں نظر ہے۔ طبرانی رحمہ اللہ وغیرہ کے طریق میں یہ ضعف نہیں ہے۔ لیکن اس میں ایک راوی مجہول ہے۔ (القول البدیع ص ۱۱۶)

ابن حبان فرماتے ہیں کہ یزید بن عبداللہ بسا اوقات خطا کرتا ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں یزید بن عبداللہ قوی نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب لابن حجر رحمہ اللہ)

یزید بن عبداللہ کا اس حدیث میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منفرد ہونا ضعف ہے اور ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے سماع میں شبہ ہے، نظر ہے۔ امام مالک، ابن حبان، ابو حاتم، ابن تیمیہ کی اس کے متعلق اچھی رائے نہیں ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کو ضعیف بتلاتے ہیں اور ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ اس لئے حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ مذکورہ حدیث صحیح کے اونچے مقام پر نہیں پہنچ سکتی ہے اور جس سند سے حدیث مذکورہ طبرانی میں مذکور ہے۔ اس میں مجہول راوی ہے اور روایت کے لئے ایک راوی کا مجہول ہونا بڑا ضعف ہے اور ابوداؤد کے مذکورہ حدیث میں حمید بن زیاد ابوصخر راوی ہے۔ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ یہ سچا ہے۔ مگر وہم اس کو ہوتا ہے۔ بہرحال مذکورہ حدیث حسن ہے اور جب مطلقاً حسن کسی حدیث کو کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حسن لذاتہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حسن لذاتہ صحیح حدیث کی طرح دلیل ہے۔ اس سے احتجاج کیا جاتا ہے کہ سلام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روح لوٹائی گئی ہے اور روح لوٹانے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے لئے (استغفر اللہ) یہ حدیث دلیل ہوسکتی ہے۔

جو حضرات محدثین کے علوم اور اصول حدیث کو جانتے ہیں وہ مذکورہ سوال کا سیدھا اور مختصر یہ جواب دیتے ہیں کہ حسن لذاتہ دلیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ احتجاج کرنا صحیح نہیں ہے۔ جب تک اس کا متن بھی اس کی سند کی طرح حسن ثابت نہ ہو جائے اور اس کے متن میں شذوذ اور علت نہ ہو اور کسی نہ کسی طریق سے بجائے حسن ہونے کے وہ صحیح ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ جزائری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سنن کی کتابوں میں جن میں ابوداؤد بھی ہے۔ کسی حدیث سے احتجاج کرنے والا اگر صحیح اور غیر صحیح میں تمیز کرسکتا ہے تو اس حدیث کی سند کے اتصال اور روایت کے اصول پر غور کرے اور سوچ کر فیصلہ کرے کہ اس کی بحث و نظر کے نتیجہ میں وہ حدیث صحیح ہے یا حسن ہے یا ضعیف ہے اور اس کے باوجود بھی اگر سنن کی حدیث سند کے اعتبار سے صحیح یا حسن ثابت ہو جائے۔ مگر جب تک اس کا متن شذوذ اور علت سے خالی نہ ہو تو

وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔ اس لئے کہ سند کی صحت اور حسن متن کی صحت اور حسن کا ضروری تقاضا نہیں کرتا اور جب ثابت ہو جائے کہ اس کا متن بھی شذوذ اور علت سے خالی اور پاک ہے تو پھر وہ حسن دلیل اور قابل احتجاج ہے۔

ابن صلاح نے کھول کر بیان کیا ہے کہ اسناد کا صحیح اور حسن ہونا حدیث کے صحیح اور حسن ہونے کا تقاضا نہیں کرتا۔ محدثین کا یہ کہنا اس حدیث کی سند صحیح یا حسن ہے۔ محدثین کے اس کہنے سے قوت اور درجہ میں کم ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا یہ حدیث حسن ہے۔ اس لئے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ شاذ ہے یا معلل ہے۔ ہاں اگر مصنف معتمد جب کہ اس قدر کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور کسی علت یا قدح کا اس میں ذکر نہیں کرتا تو اس کا ظاہر یہ ہے کہ وہ اس کو صحیح فی نفسہ سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ عدم علت اور عدم قادح اصل اور ظاہر ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن صلاح کے اس آخری حصہ پر اس قدر تبصرہ کیا ہے۔ مجھے شک نہیں ہے کہ معتمد امام حدیث جب کسی حدیث کو صحیح کہنے کی جگہ صحیح الاسناد کہتے ہیں تو اس عدول کی وجہ ہے اور ضرور ہے۔ اتفاقاً صحیح کہنے کی جگہ صحیح الاسناد نہیں کیا ہے بلکہ کسی وجہ سے کہا ہے اگر احتجاج کرنے والا ایسی حدیث سے جس کو صحیح الاسناد کہا گیا ہے صحیح اور غیر صحیح میں تمیز نہیں کر سکتا ہے تو اس کے لئے صرف یہ چارہ ہے کہ وہ ائمہ حدیث کے کلام میں تجسس کرے۔ اگر ان میں سے کسی نے اس کو صحیح اور حسن کہا ہے تو وہ اس کی تقلید کرے اور اس حدیث کے متن کو صحیح یا حسن سمجھ لے۔ ورنہ ایسی صحیح الاسناد یا حسن الاسناد حدیث سے احتجاج کرنے کی جرأت اور پیش قدمی نہ کرے۔ اس لئے کہ اس میں خطر عظیم ہے۔ (توجیہ النظر ص ۱۵۵)

اور تدریب الراوی میں لکھا ہے کہ حدیث حسن احتجاج کرنے میں صحیح حدیث کی مانند ہے۔ اگرچہ قوت میں حسن صحیح سے نیچے ہے اور محدثین کا یہ کہنا حدیث حسن الاسناد یا صحیح الاسناد نیچے درجہ ہے اور اس سے اوپر درجہ محدثین کا یہ کہنا ہے۔ حدیث صحیح یا حسن۔ اس لئے کہ کبھی حدیث کا اسناد صحیح ہوتا ہے یا حسن ہوتا ہے۔ مگر اس حدیث کا متن صحیح یا حسن نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ متن میں شذوذ ہوتا ہے یا علت ہوتی ہے۔ یعنی اس کا مضمون صحیح حدیث کے خلاف ہوتا ہے یا اس میں قادح علت ہوتی ہے یعنی اس کا معنی عام نصوص کے مفہوم کے عموم کے ضد اور مزاحم ہوتا ہے۔

اور جس حسن حدیث کے ایسے دو طریقہ ہیں جن دونوں میں سے ہر ایک طریقہ الگ الگ حجت نہیں ہے تو ایسی حدیث حسن قابل احتجاج نہیں ہوتی ہے۔ جیسا کہ ابن صلاح نے کہا ہے اور اقتراح میں کہا ہے یہ جو کہا گیا ہے کہ حسن حدیث حجت ہے۔ اس سے احتجاج کیا جا سکتا ہے۔ اس میں اشکال ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسے اوصاف ضروری ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس روایت کا قبول کرنا واجب ہے۔ اگر وہ اوصاف پائے جائیں تو وہ حسن صحیح ہے اور اگر وہ اوصاف نہ پائے جائیں تو ایسے حسن سے احتجاج درست نہیں ہے۔ اگرچہ اس کو حسن کہا جائے گا۔ (تدریب الراوی ص ۹۱)

غرض یہ ہے کہ حسن حدیث کا متن بھی اگر حسن ہے اور متن کے حسن ہونے کی صورت یہ ہے کہ حسن حدیث کے طرق متعدد ہوتے ہیں۔ اگر دو صحیح طریقوں سے مروی ہے تو یہ صحیح محض ہے اور دیگر طریقوں میں سے ایک طریق کی صحت معلوم نہیں ہے تو یہ حدیث حسن ہے اور اس کا متن بھی حسن ہے جیسا کہ اس کی سند حسن ہے۔ (توجیہ النظر ص ۱۶۲)

غرض یہ ہے کہ وہ حسن حدیث قابل احتجاج ہے جو کسی ایک طریقہ سے وہ صحیح ثابت ہوتی ہے اور اگر صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہوتی ہے تو اس کا متن اس کی سند کی طرح حسن ہے اور صرف سند میں جو حدیث صحیح یا حسن ثابت ہوتی ہے تو

وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے متن میں شذوذ یا علت ہو محدثین کے مذکورہ اصول کے مطابق ابوداؤد کی مذکورہ حدیث کہ سلام کے بعد حضور ﷺ کی روح حضور ﷺ کو لوٹائی جاتی ہے۔ کسی طریقہ سے صحیح ثابت نہیں ہے اور محدثین نے اس کو سند کے اعتبار سے حسن کہا ہے۔ اس کے رجال کو ثقہ کہا ہے۔ اگر چہ اس کے رجال میں ایسے بھی ہیں جن کو وہم ہوتا ہے اور جو خطا کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جن کو اوپر کے راوی سے سماع میں شبہ ہے اور بعض طریقہ میں مجہول راوی بھی ہیں۔ مگر تعدیل کا پہلوان حضرات کو غالب ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو حسن فرمایا ہے۔

مگر اس کے متن کی تصحیح کسی امام حدیث نے نہیں کی ہے اور جب کسی صحیح طریقہ سے کسی امام حدیث کو ثابت نہیں ہے۔ اس لئے اس کا متن حسن ثابت نہیں ہوتا ہے اور قابل احتجاج نہیں ہے۔ وہ اس دعویٰ کے لئے رد روح سے پیشتر حضور ﷺ کی حیات نہیں تھی دلیل نہیں ہوسکتی ہے اور اس کے متن میں شذوذ اور علت بھی موجود ہے۔ اس لئے کہ اس کا یہ مضمون کہ رد روح سے پیشتر حضور ﷺ کی حیات نہیں تھی۔ اس صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ جس نے انبیاء علیہم السلام کی مستمر اور دائمی حیات کی خبر دی ہے اور اس کی تصحیح حدیث کے ائمہ نے کی ہے اور صرف سند کی تصحیح نہیں کی ہے بلکہ سند کی طرح اس کے متن کی تصحیح فرمائی ہے اور علت اس میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کی قبروں کی زیارت کرتے ہوئے فرمایا: یا اللہ تیرا نبی اور تیرا بندہ گواہی دیتا ہے کہ یہ شہداء ہیں اور جو ان کی زیارت کرتا ہے یا ان پر سلام پڑھتا ہے، قیامت تک یہ اس کو جواب دیتے ہیں۔ (وفاء الوفاء ص ۹۳۳)

اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی قبر پر حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر فرمایا: یا اللہ تیرا نبی تیرا بندہ گواہی دیتا ہے کہ یہ شہداء ہیں۔ لوگو! ان کے پاس آؤ اور ان پر سلام پڑھو۔ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں تو یہ سلام پڑھنے والے کو جواب دیتے ہیں۔ (وفاء الوفاء ص ۹۳۱)

حضور ﷺ نے شہداء احد کی قیامت تک دوام حیات کی خبر دی ہے اور قرآن شریف میں شہداء کی مستمر حیات مذکور ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انبیاء اپنے مقام میں بدرجہا شہداء سے اونچے اور برتر ہیں اور شہداء کے دوام حیات سے انبیاء کی حیات کا دوام اور استمرار اعلیٰ اور بلند نہ ہو جیسا کہ ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مضمون اس کو موہم ہوتا ہے۔ بہرحال حضور ﷺ کی حیات کے دوام کے خلاف اور رد روح سے پیشتر حضور ﷺ کی موت پر ابوداؤد کی حدیث سے احتجاج کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں شذوذ اور علت ہے۔ اس لئے وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔

مولوی صاحب کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

پہلے صفحات میں مفصل لکھا گیا ہے کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک محدثین اور فقہاء اور امت مسلمہ کے اہل علم کو اتفاق ہے کہ رسالت مآب ﷺ عالم برزخ میں اپنے آرام گاہ میں دنیا کی حیات جیسی جسمانی حیات میں زندہ ہیں۔ مگر مولوی محمد اسماعیل صاحب کو اس سے شدید انکار ہے اور بڑی بے دردی سے عقل مندوں کی یاوہ گوئی کی آڑ لے کر حضور ﷺ کی جسمانی حیات اور امت مسلمہ کے اس دیرینہ اور مضبوط اعتقاد کا تمسخر اور مذاق اڑایا ہے۔

لکھتے ہیں: اس مذکورہ فکر و نظر پر عقل مندوں کے اعتراضات ہیں۔ جن سے حضور ﷺ کی حیات جسمانی اور حقیقی زندگی کا انکار کرنا ضروری ہے۔ مثلاً زندہ نبی کی دیوار کی اوٹ میں چھپانے کی کیا حکمت ہے اور اس سے کیا حاصل اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر کیسے تشریف رکھی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ترکہ کیوں طلب کیا اور

حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کی شہادت پر تعزیت کے لئے کیوں تشریف نہ لائے۔ وغیرہ وغیرہ الخ

مجھے افسوس ہے کہ ہماری مولوی صاحب عقلمندوں کے سوالات سے اس قدر متاثر اور عاجز آ گئے ہیں کہ امت مسلمہ کا مسلمہ نظریہ پس پشت ڈال دیا۔ غیر مقلدیت کی تو بڑی شان ہے۔ مبارک احمد ناگوری کے پاس غیر مقلدیت کی دولت تھی۔ جس نے دین الٰہی کی تعمیر میں اکبر کے دربار میں اس کو روسیا کر دیا تھا۔ مرزا کے پاس غیر مقلدیت کا سرمایہ تھا۔ جس نے اس کے دوستوں کی دولت سے اس کو مالا مال اور اسلام کے دائرہ سے باہر کر دیا۔ لیکن ہمارے مولوی صاحب عقل مندوں کی یاوہ گوئیوں سے شکست کھا گئے ہیں۔ کیا سنن و آثار اور امت کے مسلمہ اعتقاد کا صرف اس قدر وزن ہے کہ عقل مندوں کے مطالبات پر ان کو قربان کر دیا جائے۔ مخدوما کسی عقل مند کا مطالبہ اور سوال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام میں نفخ روح سے پیشتر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے نوازا جا چکا تھا۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کے تشریف لے جانے کے بعد سب کے آخر میں آپ کا ظہور ہوا۔ معلوم نہیں اللہ میاں کو اس قدر پیشتر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب سے سرفراز فرمانے اور ہزار ہا سال چھپائے رکھنے کی حاجت کیا تھی۔ شاید یہ کہانی خوش عقیدگی ہے۔ کسی عقل مند کا سوال ہے کہ انسانی مستقر زمین ہے اور انسان کی طبعی عمر معلوم ہے کہ زیادہ سے زیادہ کس قدر ہو سکتی ہے اور انسانی ضروریات بھی سب جانتے ہیں۔ خدا جانے اللہ میاں کو کون سی مجبوری تھی کہ زندہ مسیح کو کسی نامعلوم کونہ میں غائب کر دیا اور اس کی طبعی ضروریات کو بند کر دیا۔ استغفر اللہ!

کسی عقل مند کا سوال ہے کہ بیت المقدس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے لئے حضرت مسیح تشریف لائے تھے۔ کیا اچھا موقعہ تھا کہ حضرت مسیح بیت المقدس میں ایک تقریر فرماتے کہ یہود نے اس کو قتل نہیں کیا تھا اور نہ وہ صلیب کی لعنتی موت مارے گئے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی اصلاح ہو جاتی یا ان پر اتمام حجت ہو جاتا۔ معلوم نہیں اللہ میاں کو کیا اس قدر جلدی تھی کہ حضرت مسیح کو موقع دیئے بغیر جلدی سے پھر چھپا دیا۔ تقریباً ایک سو سال مسیح موعود کے آنے کا اور سرینگر میں حضرت مسیح کی وفات کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اگر حضرت مسیح زندہ ہے تو کیا کسی اجلاس میں یا بڑے دنوں کے اجتماع میں ایسے جھوٹوں اور افتراء پردازوں کے جھٹلانے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کا آنا ضروری نہیں ہے اور کیوں نہیں ہے۔

کسی عقلمند کا سوال ہے اگر ایمان والے کی قبر میت کی انتہا بصر تک وسیع کر دی جاتی ہے تو واقعات میں اس قدر وسعت کیوں ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ ہم تو جب بھی دیکھتے ہیں ایمان والے کی قبر بھی اسی قدر رقبہ پر محدود ہے جیسے کہ وہ بنائی گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ! مخدوما عقل مندوں کے کن کن سوالات سے لاچار ہو کر کتاب و سنت کے ارشادات و مسائل کو جواب دو گے۔ عقل مند تو بہت کچھ کہتے ہیں۔ مگر ہم تو اللہ اور اس کے رسول کے ارشاد پر باور کرتے ہیں۔ اگر آپ عالم برزخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر کسی سنت کو دلیل جانتے ہیں تو بیان کیجئے۔ ورنہ عقل مند تو آپ کو کسی دوسرے رخ پر لگانا چاہتے ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ مولوی صاحب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کس گروہ میں شمار کرتے ہیں۔ یہ سوالات تو ان سے بھی ہو سکتے ہیں۔ غالباً اس زمانہ میں کوئی عقل مند نہیں تھا۔ ورنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ضرور سوال کیا تھا۔ ابن زبالہ اور یحییٰ نے متعدد حضرات سے جن میں عبدالعزیز بن ابی حازم اور نوفل بن عمارہ بھی ہیں۔ یہ روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب آرام گاہ نبوت سے کسی قریب کے گھر میں کیل یا میخ کے ٹھوکنے کی آواز سنتیں تھیں تو آدمی بھیج کر ان کو یہ کہہ کر روکتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف مت دو

اوران حضرات نے بیان کیا ہے کہ حضرت علی ﷛ کو مکان کے کواڑ بنوانے کی ضرورت پیش آئی تو بنانے والے کو آپ نے فرمایا کہ شہر سے باہر بنا کر لائیں تاکہ اس کی آواز وغیرہ سے حضور ﷺ کو تکلیف نہ پہنچے۔ (وفاء الوفاء ج اول ص ۳۹۸)

حضرت صدیقہ ﷞ اور امیر المؤمنین ﷛ کو آرام گاہ نبوت میں حضور ﷺ کی جسمانی حیات کا اس قدر یقین تھا کہ آرام گاہ نبوت میں کواڑ بنانے کے وقت کی آواز سے اور قریب کے مکان میں کیل یا میخ کے ٹھوکنے کی آواز سے حضور ﷺ کو تکلیف جانتے ہیں اور لوگوں کو روک دیا تھا۔ اگر نعوذ باللہ حضور ﷺ کی جسمانی حیات کا ان حضرات کو یقین اور عقیدہ نہیں ہے تو آرام گاہ نبوت میں قریب کی آواز سے حضور ﷺ کو تکلیف کا یقین ان حضرات کو کیسے ہوسکتا تھا۔ مگر کسی عقل مند نے ان سے یہ نہیں پوچھا ہے کہ آرام گاہ نبوت میں حضور ﷺ کو زندہ حضور ﷺ کو کیوں قید و بند کر دیا گیا ہے۔ استغفر اللہ! مٹی کے اس قدر بوجھ سے حضور ﷺ کی تکلیف کا کیوں پاس نہیں رکھا گیا ہے۔ کاش یہ سوال کیا جاتا تو حضرت صدیقہ ﷞ اور امیر المؤمنین کی زبان سے خفیہ اسرار کھل جاتے۔ مگر ایسا عقل مند کون بنتا۔ جیسا کہ مولوی صاحب کو میسر آیا ہے۔

اللہ کے بندے عام ایمان داروں کی قبریں بہشت کے باغیچے ہیں نہ وہ قید کرنے کے لئے دفنائے جاتے ہیں اور نہ کسی خطرہ کے پیش نظر مٹی میں چھپائے جاتے ہیں بلکہ وہ اس عالم شہادت کی محنتوں اور زہد و تقویٰ کے صلہ اور انعامات میں اللہ کی عنایات اور الطاف دکھانے کے لئے دوسرے عالم میں جس کی حقیقت اور اصل خفاء اور تستر پہنچائے جاتے ہیں۔

مولوی صاحب اہل حدیث بنتے ہیں۔ مگر عقل مندوں کی نفسیات کو سنت کے احساسات پر مقدم سمجھتے ہیں۔ شاید آپ کے اہل حدیث ہونے کا یہی معنی ہے۔ حضرت عائشہ ﷞ فرماتی ہیں میں حضور ﷺ سے یہ سنتی تھی کہ ہر ایک نبی علیہ السلام کو دنیا میں رہنے اور آخرت جانے میں اختیار دیا جاتا ہے۔ (بخاری باب مرض النبی الخ)

اور ابی مویہبہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے مجھے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئیں اور یہ کہ قیامت تک دنیا میں رہوں پھر اس کے بعد جنت ہے۔ مجھے ان میں اختیار دیا گیا۔ اگر چاہوں تو قیامت تک دنیا میں رہوں اور یا لقاء رب اور جنت میں جانے کے لئے سفر کروں۔ پس میں نے لقاء رب کے لئے اور جنت کے لئے سفر کرنا پسند کر لیا۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۱۱۲)

حضرت عائشہ ﷞ کی حدیث اور ابی مویہبہ ﷛ کی مذکورہ حدیث میں حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ صحابہ ﷡ نے حضور ﷺ کو دیوار کی اوٹ میں زندہ نہیں چھپایا ہے بلکہ صحابہ ﷡ نے لقاء رب کے سفر میں جنت اور آخرت کے سفر میں حضور ﷺ کی مشایعت کی ہے۔ حضور ﷺ اپنے اختیار سے اس سفر پر روانہ ہو گئے ہیں اور عالم شہادت سے عالم برزخ کی حد تک صحابہ ﷡ نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ عالم غیب کی عالم برزخ کی شان تستر اور خفاء ہے۔ اس لئے اس سفر میں داخل ہونے اور روانہ ہونے کے لئے حضور ﷺ کی شان کے مناسب استتار غیوبت اللہ کے نظام میں ضروری تھا۔ اس لئے موت کی صورت پیش آ گئی اور وہ بھی اس حد اور اس وقت تک کے لئے کہ جس وقت اور حد تک ایک جہاں سے دوسرے جہاں میں تبدیلی کے لئے بدلنا ضروری تھا۔

جیسا کہ حافظ ابن حجر ﷫ فرماتے ہیں: انبیاء اہل دنیا کی نسبت اموات کی صورت میں ہیں۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۵)

خلفاء ثلاثہ کی شہادت کے واقعات ایسے نہیں ہیں کہ واقع ہو چکنے کے بعد حضور ﷺ کو معلوم ہو گئے ہیں

بلکہ احد پہاڑ پر کھڑے ہوئے آپ نے فرمایا تھا۔ احد ٹھہر جاؤ تم پر ایک نبی کھڑے ہیں، دوسرے صدیق اور عمر رضی اللہ عنہ وعثمان رضی اللہ عنہ دو شہید کھڑے ہیں۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے آپ کی شہادت کی خبر سنا دی تھی۔ اب یہ کون سے نئے واقعات ہیں۔ جن کے لئے عالم غیب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا ضروری تھا! اور بخاری کے کتاب بدء الخلق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ بیان مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ابتداء پیدائش سے یہاں تک کہ واقعات بتائے کہ اہل جنت اپنے مقامات میں اور اہل دوزخ اپنے مقامات میں چلے گئے۔ جس نے یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس کو بھول گیا وہ بھول گیا۔

اور بخاری نے کتاب القدر میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان روایت کیا ہے۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک واقع ہونے والے واقعات کو ایک دن خطبہ میں بیان فرمایا۔ حاکم کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح سے مغرب تک خطبہ دیا اور قیامت تک آنے والے امور کی خبر دے دی۔ (مستدرک حاکم ج ۴ ص ۴۸۷)

آپ جانتے ہیں کہ عالم شہادت اور عالم غیب، عالم برزخ کے باشندوں کے واقعات ایسے مربوط نہیں ہیں جیسا کہ عالم شہادت کے واقعات میں باہمی ارتباط ہوتا ہے اور آپس کے ارتباطات سے مناسبات قائم ہوتے ہیں۔ اس لئے عالم غیب میں قیام فرماؤں اور عالم شہادت کے باشندوں کے مناسبات قائم نہیں ہوتے ہیں۔ عالم غیب میں جو گزرتا ہے، عالم شہادت کے باشندوں کو اس سے کچھ سروکار نہیں اور اہل دنیا پر جو گزرتا ہے۔ اس کے ساتھ عالم برزخ کے باشندوں کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ عالم شہادت میں ہونے والے واقعات جو ارتقاء وتنزل کے اسباب سے مربوط ہیں۔ ان میں قضاء وقدر کے فیصلوں میں عالم غیب سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مداخلت کی ضرورت کیا ہے۔ اس لئے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مولوی اسماعیل صاحب کا یہ بے جا گلہ ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت، مختار کی عیاریوں، بصرہ کے فتنہ میں وغیرہ وغیرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مداخلت کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی۔

تعجب ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اپنے جذبات میں نبوت کے احساسات کا اندازہ کرتے ہیں۔ شکست وریخت کے واقعات میں دوستانہ یا ہمدردانہ مراسم ہمارا رواج تو ہے۔ مگر ایسے مراسم کی پابندیوں سے انبیاء علیہم السلام کی شان بدرجہا بلند ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ آپ مثلہ کئے گئے ہیں تو آپ نے فرمایا: اگر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے رنج اور دکھ کا خیال نہ ہوتا اور یہ کہ میرے بعد یہ معمول ہو جائے گا تو میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسی حالت پر چھوڑ دیتا کہ سباع کے بطون اور طیور کے حواصل میں پہنچے۔ حمزہ! تجھ جیسا دکھ کبھی نہیں پہنچا اور کبھی ایسی جگہ کھڑا نہیں ہوا ہوں جو اس سے زیادہ غصہ دلانے والی ہے۔ (وفاء الوفاء ص ۹۳۵)

احساسات نبوت کا ضبط اور برداشت حضرت صفیہ کے مزاج کی پاسداری اور سید الشہداء کے متعلق تفویض الی اللہ کا سبق آموز درس کو ہمارے مراسم کے ساتھ کچھ لگاؤ ہے۔ کوئی بھی اپنے عم شہید کے جسد کے ٹکڑے سباع وطیور کے حوالہ کرنا پسند نہیں کرتا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اختیار دیا گیا کہ اس وقت تک دنیا رہوں کہ امت پر جب فتوحات کے دروازے کھلیں گے تو ان خوش کن اور مسرت آور حالات اور واقعات کو دیکھ لوں یا اس وقت کے آنے سے پہلے ان حالات اور واقعات کا انتظار نہ کروں اور جانے میں جلدی کروں۔ میں نے جلدی اور پہلے جانے کو پسند کر لیا ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۱۱۲)

عالم شہادت کے آنے والے واقعات کے متعلق پیغمبرانہ احساسات یہ ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہو سکتی ہے کہ جس پیغمبر علیہ السلام نے ہونے والے واقعات کے وقت آنے کے انتظار میں دنیا میں رہنا پسند نہیں کیا تھا وہ دنیا کے واقعات کے ہو چکنے کے بعد عالم غیب سے عالم شہادت میں آئے اور تمام اسرار الٰہیہ کو فاش کر دے۔

چونکہ یہ مولوی صاحب کے عقل مندوں کے سوالات نہیں ہیں بلکہ ان سے پہلے پیشرو عقلمندوں کے پرانے اٹھائے ہوئے سوالات ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ پرانے عقل مندوں کو لوگ نہیں جانتے۔ شاید اس کے زمانہ کے عقل مندوں میں پرانے عقل مندوں کا تعارف خوب ہو سکتا ہے۔ ورنہ جہاں عقل مندوں کے سوالات مولوی صاحب نے پڑھے ہیں وہاں ان کے جوابات بھی مذکور ہیں۔ اس لئے میں یہاں سید آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے مذکورہ سوالات کے جوابات کو ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

سید آلوسی رحمۃ اللہ علیہ شریعت محمدی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اخذ واستفادہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت محمدیہ کے کاملین صلحاء کو بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے اور اخذ واستفادہ کے واقعات ہو چکے ہیں۔ شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ ظہر کی نماز سے پہلے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور مجھے فرمایا: اے میرے بیٹے بولتے کیوں نہیں؟ میں نے عرض کیا میرے باپ! بغداد کے فصحاء کے سامنے میں عجمی آدمی کیسے بول سکتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے منہ میں لعاب دہن مبارک ڈال دیا اور فرمایا: اب فرمایئے!

اور خلیفہ بن موسیٰ النہر ملکی اکثر خواب اور بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اور فرماتے تھے کہ اس کے اکثر افعال اس نے خواب اور بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کئے ہیں اور شیخ ابی العباس المرسی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے کہا یا سیدی اس ہاتھ سے آپ مجھ سے مصافحہ کیجئے۔ شیخ نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اس ہاتھ سے میں نے کسی سے مصافحہ نہیں کیا اور فرمایا اگر طرفۃ العین کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں تو میں اپنے آپ کو مسلمانوں میں نہیں گنتا۔

اور اس قسم کے واقعات ارباب حقائق سے بکثرت منقول ہیں اور جن لوگوں نے وفات کے بعد بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شرف کا انکار کیا ہے۔ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تنویر الحلک فی رؤیۃ النبی والملک میں ان کی تردید کی ہے اور بخاری، مسلم، ابوداؤد کی اس حدیث سے ان پر استدلال کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب مجھے بیداری میں دیکھ لے گا اور طبرانی، دارمی نے بھی اس معنی کی حدیث کو روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے مضمون اور معنی میں حضرات علماء نے مختلف قسم کی تاویلیں کی ہیں۔ کسی نے قیامت کے دن بیداری میں زیارت کی تخصیص کی ہے اور کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے ساتھ بیداری میں دیکھنے کی تخصیص کی ہے۔

اور امام ابو محمد بن ابی حمزہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آیا یہ حدیث اپنے عموم پر ہے یا اس میں حیات کی تخصیص ہے اور نیز یہ حدیث کہ جس کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اس کو بیداری میں شرف زیارت کی بشارت دیتی ہے یا وہ حضرات اس شرف سے سرفراز ہوں گے جن میں پوری اہلیت اور کامل اتباع سنت ہے۔ حدیث کے الفاظ عام ہیں اور کسی مخصص کی تخصیص کئے بغیر خصوص کا دعویٰ ضد اور تاسف ہے۔

امام موصوف نے مفصل کلام کیا ہے اور کہتے ہیں کہ سلف اور خلف میں بیشمار حضرات ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا اور حضور ﷺ کے اس ارشاد پر ان کو یقین تھا اور انہوں نے بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور انہوں نے رسالت مآب ﷺ سے اپنی تشویش کی شکایت کی اور جن امور میں وہ پریشان تھے ان میں وجوہ اور تدبیر کو حضرت ﷺ سے پوچھا تا کہ ان کی تشویش اور تردد رفع ہو اور اطمینان نصیب ہو جائے۔ حضور ﷺ نے ان کو تدبیر بتا دی اور ایسا ہوا جیسا حضور ﷺ نے فرمایا اور انہوں نے چاہا تھا۔

اور حافظ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل علم ارباب حقائق کے نقول اور احادیث کے مجموعہ کا حاصل یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنے جسد اور روح دونوں میں زندہ ہیں اور زمین وملکوت کے اقطار واطراف میں جہاں چاہتے ہیں سیر وتصرف فرماتے ہیں اور وفات سے پیشتر جس ہیئت پر حضور ﷺ تھے۔ اب بھی اسی ہیئت پر ہیں۔ کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ صرف فرق آیا ہے تو اس قدر کہ نگاہوں سے غائب کر دیئے گئے ہیں۔ جیسا کہ ملائکہ نگاہوں سے غائب کئے گئے ہیں۔ اگر چہ وہ اپنے مناسب اجساد میں زندہ موجود ہیں۔ جب حق تعالیٰ حضور ﷺ کی زیارت سے کسی کا شرف چاہتا ہے تو حجاب اٹھا لیتا ہے اور وہ حضور ﷺ کی سابق ہیئت پر زیارت کر لیتا ہے۔ اس سے کوئی دلیل مانع نہیں ہے اور روایت مثالی کی تخصیص کی کوئی وجہ اور ضرورت نہیں۔

سید آلوسی رحمہ اللہ نے دوسرے علماء کے دوسرے اقوال بھی ذکر کئے ہیں اور اپنا عندیہ بھی ظاہر کیا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو پڑھ لیجئے اور جن حضرات نے حضور ﷺ کو بیداری میں دیکھا اور انہوں نے استفادہ کیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر سید آلوسی رحمہ اللہ نے کر دیا ہے۔

اور ان میں بعض حضرات یہ ہیں: حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے ۲۲ مرتبہ یہ شرف حاصل کیا اور بعض احادیث کے متعلق حضور ﷺ سے دریافت کیا اور حضور ﷺ کی تصحیح کے بعد حافظ نے ان حدیثوں کی تصحیح فرمائی اور امام شاذلی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ حافظ سے سلطان وقت سے اپنی سفارش کرنا چاہا تو آپ نے یہ کہہ کر انکار فرمایا۔ میں نے بہت دفعہ حضور ﷺ کی زیارت کی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رزق مجھے اللہ نے عنایت فرمایا ہے کہ میں بادشاہوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹاتا۔ مجھے ڈر ہے، اگر ایسا کروں تو مجھے اللہ تعالیٰ اس دولت سے محروم کر دے گا۔ آپ کی تھوڑی سی تکلیف برداشت کرتا ہوں۔ مگر اپنی اور امت کے بہت ضرر کو نہیں پسند کرتا۔

امام شعرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے آٹھ دوسرے رفقاء کی معیت میں حضور ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور میں نے حضور ﷺ کو بخاری کی کتاب پڑھ کر سنائی۔ (فیض الباری ج ا ص ۲۰۴)

حضرت حجۃ العلماء سید محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ ان واقعات کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت یقیناً ثابت ہے۔ اس کا انکار کرنا جہل نادانی ہے۔ مجھے ایسے حضرات صلحاء کا استقصاء کرنا مقصود نہیں ہے۔ جن کو حق تعالیٰ نے اس دولت سے نوازا ہے اور یہ رزق بخشا ہے۔ بلکہ سید آلوسی رحمہ اللہ نے جو مولوی صاحب کے سوالات کی طرح اپنے زمانہ یا اس سے پہلے عہد کے مستبعدین کے جو سوالات نقل کئے ہیں اور ان کا جواب لکھا ہے۔ ان کے نقل کرنے سے پہلے یہ مختصر سا تذکرہ ضروری تھا تا کہ ہر زمانہ کے علماء کا عندیہ مکمل جائے۔

اب سید صاحب کی باقی تحریر پڑھیے: فرماتے ہیں قبر میں حضور ﷺ کی حیات پر اگرچہ بعض ایسا ترتب ہوتا ہے۔ جیسے دنیا کی معروف زندگی پر نماز، اذان، ردالسلام وغیرہ کا ترتب ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ دنیا کی معروف زندگی میں کیا جاتا تھا۔ تمام اس مایمکن کی توقع اب بھی حضور ﷺ سے برزخ عالم غیب کی زندگی میں لازم اور ضروری ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ عالم غیب میں حضور ﷺ کی حیات ہر کہ ومہ جانے اور سمجھے۔ اگر اب بھی بالفرض نبی ﷺ کی قبر کھل جائے تو نبی ﷺ کا مقدس جسد ایسا دکھائی دے گا جیسے کہ ان اموات کے اجساد دکھائی دیتے ہیں جن کو زمین نے نہیں کھایا ہے۔

میں پھر اس تمام بحث کے بعد کہتا ہوں کہ بعض ارباب احوال کاملین کے واقعات یہ ہیں کہ انہوں نے رسالت مآب ﷺ کو دیکھا اور حضور ﷺ سے سوالات کے جوابات دریافت کئے ہیں اور استفادہ کیا ہے۔ ہم صدر اوّل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایسے واقعات نہیں جانتے ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم میں دین اور دنیا کے امور میں اختلافات ہوئے ہیں۔ صحابہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود تھے اور جن حضرات صوفیہ کے مذکورہ واقعات ہیں۔ ان کے اکثر سلاسل ان حضرات صحابہ تک پہنچتے ہیں اور ہم کو ان میں سے کسی ایک صحابی کا یہ واقعہ نہیں پہنچا ہے کہ آپ کو کسی نے بیداری میں دیکھا ہے اور آپ سے استفادہ کیا ہے اور نیز ہم کو یہ بھی معلوم نہیں ہوا ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی ایک صحابی کو تحیر وتردد کے وقت حضور ﷺ نے ظاہر ہو کر کچھ فرمایا ہے اور اس کے تحیر کو رفع فرمایا ہے۔

اور صحیح ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض امور میں یہ فرمایا کاش! میں حضور ﷺ سے یہ پوچھا ہوا ہوتا اور یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ ارباب احوال کی حکایات کی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضور ﷺ سے دریافت کرنے کا توسل کیا ہے اور نیز حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حزن عظیم حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ جانتے ہیں اور فدک کا اہم مطالبہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ حضور ﷺ نے آپ کے سامنے ظہور فرمایا ہے کہ حضرت بتول رضی اللہ عنہا کا حزن ہلکا ہو جاتا اور حقیقت حال سے واقف ہو جاتیں۔ آپ نے سنا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بصرہ کی طرف تشریف لے گئی ہیں اور جمل کا ہولناک واقعہ آپ کو پیش آیا ہے۔ کیا آپ نے سنا ہے کہ حضور ﷺ نے کچھ تعرض فرمایا اور ام المؤمنین کو روانہ ہو جانے سے پہلے روکا تھا اور ایسے واقعات بہت ہیں۔

غرض یہ کہ کسی صحابی اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ کے ظاہر ہونے کی زیادہ ضرورت تھی۔ مگر کسی ایک کے لئے بھی آپ نے ظہور نہیں فرمایا ہے اور اگر یہ کہا گیا ہے کہ مسجد قبا کے دروازے کے قریب شیعہ حضور ﷺ کے ظہور کی حکایت کرتے ہیں تو یہ محض افتراء اور فریب ہے۔ ہاں! ضرور ارباب احوال کو حضور ﷺ کے ظاہر ہونے کی ایسی وجہ اور توجیہ ہے اور ہونی چاہئے۔ جس سے ارباب عقل وافہام کو اطمینان ہو۔ مجھ سے اس کہنے کی توقع اور حسن ظن مت رکھو کہ ارباب تصوف کے وہ واقعات جو بیان کئے جاتے ہیں، جھوٹ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے واقعات کثرت سے منقول ہیں اور جن کے واقعات ہیں ان کی شان بڑی ہے۔ ان کی جلالت اور واقعات کی کثرت اس واقعات کی صحت کی شہادت دیتی ہے اور نیز مجھ سے اس کہنے اور اس کہنے کا حسن ظن بھی نہ کیجئے کہ ارباب احوال نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا۔ مگر خفت نوم اور قلت وقت سے انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ بیداری میں ان کو یہ شرف حاصل ہوا۔ اس لئے کہ ان کی شان سے یہ بعید ہے اور ان کے کلام میں ایسے امور ہیں جو اس سے انکار کرتے ہیں۔

بہت سے بہت میں یہ کہتا ہوں کہ بیداری میں ان حضرات کا حضور ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کرنا خرق عادت امر تھا۔ جیسے اولیاء کی تمام کرامات کا اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا یہ حال ہے اور صدر اوّل میں عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں خوارق بہت ہی نادر ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عہد آفتاب رسالت کے قریب تھا بلکہ متصل۔ آپ جانتے ہیں کہ آفتاب کے شعاع کے نیچے اور جب آفتاب کا ضوء پھیل جاتا ہے۔ کوئی ستارہ کہاں دکھائی دیتا ہے۔ اگر چہ موجود ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ارباب احوال کی طرح بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے بھی نادر ایسے واقعات ہوں لیکن ان واقعات کا افشاء وقت کے مصالح کا تقاضا نہ تھا۔ تاکہ صحابہ کے بعد لوگ ہمیشہ اس توقع میں نہ رہیں اور اس کو آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں سنت نبوی نہ سمجھیں جیسے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ میں حضور ﷺ کا کچھ ارادہ تھا۔ مگر آپ نے اس لئے اس کو پورا نہیں کیا کہ لوگ بعد میں اس کو سنت سمجھیں گے اور ہوسکتا ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہ ابتلاء کی حکمت کا تقاضا یہ تھا یا اس لئے کہ فتنہ کا خوف تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بیان میں والہانہ عقیدت میں کسی اور رنگ کا امکان تھا یا اس لئے کہ عہد صحابہ میں ایسے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے کہ وہ ہو بہو حضور ﷺ کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہیں یا اس لئے کہ اہم اور ضروری دینی اور دنیوی امور میں کتاب وسنت کی طرف لوگ دوڑیں اور حضور کے بالمشافہ ارشادات کا انتظار نہ کریں تاکہ اجتہاد کا باب وسیع تر ہو اور شریعت پھیل جائے یا مثل اس کے اور توجیہات بھی کی جاسکتی ہیں اور یہ کہا گیا ہے کہ عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی کسی کسی صحابی کو حضور ﷺ کا ظہور ہوا ہے۔ جیسا کہ روایت کیا گیا ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے چاہا کہ حضور ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کریں تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور اپنا ارادہ ظاہر کی تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کا آئینہ سامنے کیا۔ اس صحابی رضی اللہ عنہ کو اس میں اپنی صورت نظر نہیں آتی تھی اور حضور ﷺ کی مقدس صورت کی وہ زیارت کررہا تھا اور یہ ظہور ویسا ظہور ہے۔ جس کا صوفیا دعویٰ کرتے ہیں۔ صرف مرأۃ کے حجاب کا فرق ہے اور یہ تخیل نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے آئینہ میں متواتر تصور سے قوی ہوگیا ہے کہ بسا اوقات ایسا ہو جاتا ہے جیسا ابن خلدون نے گمان کیا ہے۔ الخ (روح المعانی تفسیر آیت خاتم النبیین ج ۲۲ ص ۳۷)

غرض یہ ہے کہ ارباب علم کو ارباب حقائق سے بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت کے امکان اور وقوع پر اتفاق ہے۔ اس لئے ارباب حقائق کے واقعات کو نہ جھٹلاتے ہیں اور نہ ایسی توجیہ اور تاویل کو پسند کرتے ہیں۔ جس میں حقیقت واقعی ظاہر نہیں ہوتی ہے بلکہ ایسے معانی بتلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس پر دونوں گروہ متفق ہو سکتے ہیں۔ البتہ ایسے معانی کے تسلیم کرنے میں بظاہر کچھ تامل کرتے ہیں۔ جو عوام کے عامیانہ ذہن میں اوّل وہلہ بیٹھتے اور اترتے ہیں۔ مگر بعض ارباب علم کا یہ فکر ونظر بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت اور حضور ﷺ سے استفادہ کے انکار کا متحمل نہیں ہوتا ہے اور اگر عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں ارباب حقائق کی طرح کے واقعات کم نادر ملتے ہیں یا منظر عام پر ظاہر نہیں ہوتے تو وہ ایسی معنوی حکمتوں کا تقاضا ہے۔ جن کی تہہ میں کتاب وسنت کا مرموز منشاء حق تعالیٰ نے پورا کرنا چاہا تھا اور جوں جوں آفتاب رسالت کا قرب دور ہوتا گیا اور دین کے لئے کچھ ظلمات کی راہیں کھلنے لگیں تو حق تعالیٰ کے لطف واحسان کا تقاضا ہوا اور اللہ کے علم میں جو اس قابل اور سرفرازی کا مستحق تھا اس کو یہ موقعہ بخشا گیا ہے۔

اور صحابہ کے فہم و بصیرت میں کتاب و سنت کے معانی کو اللہ نے متعین کرنا چاہا تھا اور صحابہ کے اختلافات میں اجتہاد کے لائنوں کو واضح اور مضبوط کرنا چاہا تھا اور صحابہ کے اجتہاد و سعی کی ابتلاء اور امتحان بھی مقصود تھا۔ اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مناسب اللہ کی گہری حکمتوں کا تقاضا بھی تھا کہ دنیا کو ان کے علم فہم سے روشناس کیا جائے اور ان کے اختلافات میں دنیا کو ذہنی اور فکری اختلافات کے امکان کا درس دیا جائے اور بتا دیا جائے کہ مخلصانہ اختلافات میں صرف ایک مرکز کتاب و سنت تک پہنچنے کی کوشش مقصود ہونا چاہئے اور جیسے کہ تفرقہ اور جماعت بندی سے صحابہ کے دامن اجتہاد پاک رہا ہے۔ اس غرض کے لئے اور اس قسم کے اجتہاد کے لئے بقید ضرورت اور مجتہدانہ بصیرت کی شرط سے ہمیشہ دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس عہد میں حضور ﷺ کے بیداری کی حمایت کو نادر رکھا یا کسی وقت کے لئے روک دیا۔ یہی حال مولوی اسماعیل صاحب کے مذکورہ سوالات کا حل ہے۔ خوب سوچ لیجئے!

حضور ﷺ کی جسمانی حیات کی تیسری دلیل

کتاب و سنت کے وسیع دفتر میں کوئی صفحہ ایسا نہیں ملتا ہے۔ جس نے نعوذ باللہ آرام گاہ نبوت میں حضور ﷺ کے پاکیزہ اور بابرکت جسد کو بے جان اور مردہ بتا دیا ہے۔ امت کے محدثین اور صلحاء نے عالم غیب میں حضور ﷺ کی حیات کی تلقین کی ہے اور تمام اہل علم کو آرام گاہ نبوت میں حضور ﷺ کی جسمانی حیات پر اتفاق ہے۔ امت کے اہل علم اور ارباب حقائق کا اتفاق قطعی دلیل ہے کہ آرام گاہ نبوت میں عام اموات کی طرح حضور ﷺ کو بے جان مردہ بتلانا دین کے ارباب عمائد سے نکل کر باہر ہونے کی بے باکانہ جسارت ہے اور ارباب علم و فقہ کے اس اتفاق کا ماخذ حضور ﷺ کے وہ ارشادات ہیں جو محدثین کو صحیح ثابت ہیں۔ کچھ مذکور ہوئے اور کچھ ذیل میں پڑھیے:

ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص میرے قریب میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے تو میں اس کو خود سنتا ہوں اور جو میری قبر سے دور مجھ پر درود پڑھتا ہے تو اس کو میرے پاس فرشتہ پہنچا دیتا ہے۔

(بیہقی شعب الایمان، احیاء الاذکیاء)

اس حدیث کے متعلق ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابوالشیخ اور ابن حبان نے کتاب ثواب الاعمال میں جید سند کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔ (مرقات ج ۲ ص ۱۰)

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ نے زمین پر کچھ فرشتے مقرر فرمائے ہیں جو زمین پر گشت لگاتے رہتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھے پہنچا دیتے ہیں۔ (مسند امام احمد حدیث نمبر ۳۶۶۶، ۴۲۱۰، ۴۳۲۰)

احمد شاکر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ بیہقی نے حیات الانبیاء (ص ۱۰) پر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ موکل کیا ہے جو شخص مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ فرشتہ اس کو میری قبر میں میرے پاس پہنچا دیتا ہے۔ جیسا کہ تمہارے ہدایا پہنچائے جاتے ہیں اور وہ فرشتہ مجھ پر درود پڑھنے کا نام اور نسب بھی مجھے بتلاتا ہے اور میرے پاس ایک سفید صحیفہ ہے اس میں اس کا نام اور اس کا نسب وغیرہ لکھ دیتا ہے۔

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: اللہ کا ایک فرشتہ جس پر حق تعالیٰ نے یہ عنایت فرمائی ہے کہ وہ لوگوں کی آہستہ بات اور زور کی بات دونوں کو سنتا ہے وہ فرشتہ میری قبر پر کھڑا ہے جو مجھ پر درود پڑھتا ہے وہ فرشتہ اس کو میرے پاس پہنچا دیتا ہے۔ (الحاوی ج ۲ ص ۱۴۸)

عبداللہ ابن مسعود، ابوہریرہ، حضرت انس، عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہم) کی مذکورہ حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص آرام گاہ نبوت کے قریب ہو کر درود پڑھتا ہے تو حضور ﷺ اس کو سنتے ہیں اور اگر کوئی آرام گاہ نبوت سے دور ہو کر درود پڑھتا ہے تو اس کو فرشتہ آپ کے پاس آرام گاہ میں پہنچا دیتا ہے اور حضور ﷺ کے پاس صحیفہ ہے اس میں درود پڑھنے کا نام وغیرہ اس میں درج کرتا ہے۔ حضور ﷺ کے یہ ارشادات حضور ﷺ کی جسمانی حیات کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں اور اس کی استدلالی وجوہات یہ ہیں:

پہلی وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے آرام گاہ میں اپنا حال ایسا ظاہر فرمایا ہے۔ جس طرح دنیا کی زندگی میں آپ کا یہ حال تھا کہ جو سامنے آ کر آپ کو سلام عرض کرتا تھا تو آپ خود جواب عنایت فرماتے تھے اور اگر کوئی دور ہوتا تھا اور کسی کی معرفت سلام بھیجتا تھا تو اس کے مناسب جواب عنایت فرماتے۔ آرام گاہ نبوت میں بھی یہی حال حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ اگر آپ قریب کھڑے ہیں تو خود سلام عرض کرتے ہیں اور اگر آپ دور ہیں تو آپ کا سلام فرشتے حضور ﷺ سے عرض کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں کلام وسلام کے سننے اور جاننے کے لئے قرب اور بعد کا جو آئین تھا وہی حضور ﷺ کے لئے آج بھی قائم ہے اور اس سے ہم سمجھتے ہیں کہ آرام گاہ نبوت میں دنیا کی زندگی جیسی حضور ﷺ کی زندگی ہے۔

دوسری وجہ استدلال کی یہ ہے کہ درود پڑھنے والے کے قرب اور بعد کا اندازہ حدیث میں حضور ﷺ کے آرام گاہ کے قرب اور بعد سے بتایا گیا ہے اور قبر میں حضور ﷺ کا مقدس جسد محفوظ اور امانت ہے اور حضور ﷺ کی قبر مبارک میں حضور ﷺ کا جسد زندہ ہے۔ اس لئے اس کے قریب ہونے والے کے براہ راست اور اس سے دور ہونے والے کے درود کو فرشتے کے واسطے سے آپ سنتے ہیں اور صرف روح کے لئے قبر کی نسبت سے درود وسلام پڑھنے والے کے لئے قرب و بعد کا تصور بھی نہیں ہوتا ہے۔

تیسری وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ارشادات میں آرام گاہ نبوت کی تخصیص کی گئی ہے کہ میری قبر کے قریب جو مجھ پر درود پڑھتا ہے اور میری قبر سے جو دور مجھ پر درود پڑھتا ہے تو میں سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قبر میں آپ کی زندگی ہے۔ اس لئے قبر میں سنتے ہیں اور قبر سے جواب دیتے ہیں اور قبر میں جسد اور جسمانی زندگی کے سوا روحانی زندگی اس لئے متصور نہیں ہے کہ روح کے لئے قبر اور غیر قبر دونوں برابر ہیں۔ قبر کی تخصیص کی اور قبر میں روح کے ہونے کے لئے نہ ضرورت ہے اور نہ لزوم اور اس معنی کی حضور ﷺ کی قبر میں جسمانی حیات کی تائید حضور ﷺ کے مذکورہ ارشادات سے بھی ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن کثرت سے مجھ پر درود پڑھا کرو۔ کیونکہ جمعہ کے دن تمہارا درود میرے سامنے پیش کیا جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہمارا درود آپ کے سامنے کیسے پیش کیا جائے

گا۔ آپ کا جسد مٹی میں مل گیا ہوگا۔ مٹی نے اس کو بگاڑ دیا ہوگا۔ حضور ﷺ نے صحابہ ؓ کے جواب یہ ارشاد فرمایا: انبیاء کے اجساد کو اللہ نے زمین پر حرام کردیا ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے باب تفریع الجمعہ اور باب الاستغفار میں روایت کیا ہے۔ دارمی نے فضل جمعہ میں روایت کیا اور حاکم نے مستدرک (ج اول ص ۲۷۸) میں روایت کرنے کے بعد لکھا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ بیہقی نے (سنن کبریٰ ج ۳ ص ۲۴۹) میں روایت کیا ہے اور قرطبی نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے اور حافظ ابن قیم کی قرطبی کی تصحیح کے ساتھ اتفاق ہے۔ (کتاب الروح ص ۵۴)

اس حدیث سے حضرت انس ؓ کے حدیث کی اور سابق اس معنی کی کہ حضور ﷺ اپنے آرام گاہ میں اپنے جسد میں زندہ ہیں۔ تائید اس طرح ہوتی ہے کہ صحابہ ؓ کو حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود شریف پڑھا کرو۔ کیونکہ تمہارا درود مجھ پر اس وقت اور اس حال میں بھی پیش کیا جائے گا۔ جب عالم غیب میں قبر میں میرے جسد میں میری حیات ہوگی تو صحابہ ؓ کو اس سننے پر تعجب ہوا اور صحابہ ؓ نے جسد اقدس کے متعلق عالم برزخ میں حال اور وقت کے متعلق تعجب سے سوال کیا کہ یہ کیسے ہوگا۔ قبر میں مٹی آپ کے جسد کو کھا لے گی۔ حضور ﷺ نے صحابہ ؓ کو یہ جواب فرما کر سمجھا دیا کہ عالم برزخ میں انبیاء ؑ کے اجساد کو اللہ نے زمین پر حرام کردیا ہے۔ انبیاء ؑ کے اجساد ان کی قبروں میں محفوظ ہیں اور انبیاء اپنے اجساد میں اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ایسی زندگی میں ہیں۔ جب ان پر درود پڑھتے ہیں ان پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ کو حضور ﷺ کی حیات میں شک نہیں تھا۔ لیکن ان کو خیال تھا کہ قبر میں انبیاء کے اجساد کا نظام بھی بگڑتا ہوگا۔ جیسا کہ عام اموات کے اجسام کا نظام بگڑ جاتا ہے اور نیز حضور ﷺ کے ارشاد سے صحابہ ؓ نے بھی یہ سمجھ لیا تھا کہ ان کا درود حضور ﷺ کی جسمانی زندگی میں حضور ﷺ کے سامنے پیش ہونے کی حضور ﷺ نے ان کو خبر دی ہے۔ اس لئے ان کو تعجب ہوا ہے۔

اور اپنے فکر کو حضور ﷺ کے ارشاد کے تطابق میں حیران ہوگئے۔ حضور ﷺ نے ان کے تعجب اور تحیر کو رفع فرمایا اور سمجھا دیا کہ انبیاء کے اجساد کے متعلق ان کو غلط فہمی تھی۔ اگر حدیث میں حضور ﷺ کی مراد یہ ہوتی کہ حضور ﷺ کی روح پر صحابہ ؓ کا درود پیش کیا جائے گا تو کیا آپ کے خیال میں نعوذ باللہ صحابہ اس قدر بے سمجھ تھے کہ انہوں نے حضور ﷺ کے ارشاد میں حضور کے جسد پر درود کا معروض ہونا غلط سمجھا اور حضور ﷺ کے جسد کے بارے میں بے جا تعجب اور سوال کیا ہے۔ اگر حضور ﷺ کی مراد یہ ہوتی کہ حضور ﷺ کی روح پر درود پیش کیا جائے گا اور صحابہ ؓ نے غلطی سے جسد پر درود کا پیش ہونا سمجھ لیا تھا تو حضور ﷺ کے اس جواب کا زمین پر اللہ نے انبیاء کے اجساد کو حرام کردیا ہے۔

استغفر اللہ! کچھ محل اور معنی نہیں ہے۔ ایسے حال اور فہم میں حضور ﷺ کا ارشاد یوں ہونا چاہئے تھا کہ حضور ﷺ کے جسد کے بارے میں تمہیں تعجب اور سوال کیوں ہے۔ درود میری روح پر پیش کیا جائے گا۔ مگر حضور ﷺ کا جواب وہی ہے جو مذکور ہوا۔ صحابہ نے بالکل یہ صحیح سمجھا تھا کہ حضور ﷺ پر درود شریف کے پیش ہونے کا یہ معنی ہے کہ حضور ﷺ کا جسد مبارک زندہ ہے اور اس زندہ جسم میں حضور ﷺ پر درود پیش کیا جائے گا۔ حضور ﷺ کے جسم کی زندگی کے متعلق صحابہ کو شک ہوا تو حضور ﷺ نے جواب فرما کر ان کو مطمئن کردیا کہ ہاں میں اپنی قبر میں اپنے جسد میں زندہ ہوں اور مجھ پر اسی جسدانی حیات میں تمہارا درود پیش کیا جائے گا۔

چند واقعات

سید نورالدین الایجی فرماتے ہیں میں حضور ﷺ کے روضہ مطہرہ کے پاس پہنچا اور میں نے کہا السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مجھے خلوت نبوت سے یہ جواب ملا۔ وعلیک السلام یا ولدی! وہاں اس وقت جس قدر حاضرین تھے سب نے حضور ﷺ کا یہ جواب سنا اور ابونصر عبدالواحد بن عبدالملک فرماتے ہیں میں حج سے فارغ ہوکر حضور ﷺ کی زیارت کے شرف حاصل کرنے کے لئے مدینہ منورہ میں حاضر خدمت ہوا۔ ابھی حجرہ مقدسہ کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ شیخ ابوبکر الدیار بکری حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا السلام علیک یا رسول اللہ! میں نے حضور ﷺ کی آرام گاہ کے اندر سے یہ جواب سنا۔ وعلیک السلام یا ابا بکر! اور جس قدر لوگ بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ ان سب نے حضور ﷺ کا یہ جواب سنا۔ (الحاوی ج ۲ ص ۲۶۱)

حضور ﷺ کی قبر سے جواب کا ملنا اور جوار نبوت میں اس جواب کا سننا اہل علم اور ارباب حقائق کے اس قدر کثیر واقعات ہیں جن کا انکار کسی وقت بھی اہل علم نے نہیں کیا ہے اور یہ ان حضرات کے ایسے واقعات ہیں جن سے اس تحقیق کی تصدیق وتائید ہوتی ہے کہ حضور ﷺ آرام گاہ نبوت میں بجسد عنصری حیات ہیں اور امت مسلمہ میں یہ کسی نے نہیں کہا ہے کہ آرام گاہ نبوت میں حضور ﷺ کا جسم مبارک بے جان ہے اور حضور ﷺ کے آرام گاہ میں حضور ﷺ کی روح استغفر اللہ! بند کردی گئی ہے اور اس کی حیات کے آثار گاہ بگاہ ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ حیات کے افعال اور زندگی کے اعمال صرف روح کے لئے بدوں حیات جسم ناممکن ہیں۔ اس تحریر کو میں یہاں ختم کردینا چاہتا ہوں۔ لیکن آخر پر حجۃ الاسلام حضرت شیخ العلامہ سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علم کے چند اقتباسات لکھنا چاہتا ہوں۔

خاتمہ

حضرت شاہ صاحب نے بخاری کے درس میں حیات رسالت مآب کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا تھا۔ آج مولوی بدر عالم صاحب میرٹھی کی کوششوں میں فیض الباری کے صفحات میں مذکور ہیں۔ میں اسی کتاب سے حضرت شاہ صاحب کے استفادات یہاں اس لئے نقل کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اختصار اس قدر جامع بسط پر شامل ہے کہ اس کے سوچنے اور سمجھنے کے بعد اہل علم کی بہت سی مشکلات اور الجھنیں حل ہوسکتی ہیں اور اس علمی ونظری سرمایہ کے بغیر اس وقت حیات نبوت پر کوئی بصیرت کامل نہیں ہوتی ہے اور میں اور مجھ جیسے دوسرے ہزارہا اس عظیم العلیم اور کبیر الشان فقیہ کے فیوض اور استفادات سے آثار وسنن کی راہ میں رواں دواں جارہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کتاب وسنت کی زبان میں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ قرآن کی آیات اور حضور ﷺ کی سنت میں جو لفظ حیات انبیاء اور شہداء کے لئے ارشاد فرمایا گیا ہے وہ صرف ایسی حیات نہیں ہے کہ جسم وجسد کی زندگی کے بدوں صرف روحانی زندگی پر منطبق ہوتا ہے۔ اس لئے کہ لفظ حیات کے علاوہ اس کے ساتھ ایسے افعال حیات قرآن وحدیث میں مذکور ہوتے ہیں کہ وہ جسد اور جسم میں حیات کے بغیر صرف روح کے لئے ناممکن ہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کے جسمانی حیات کے علم واعتقاد کے بغیر روحانی

حیات کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کتاب وسنت میں کوئی چارہ نہیں ہے۔ بخاری کتاب العلم حضرت عائشہ ﷞ کی حدیث میں نم صالحاً قد علمنا ان کنت لموقناً بہ آرام سے سو جاؤ ہم نے جان لیا کہ آپ کو اس کا یقین اور باور تھا۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں: اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قبور اعمال سے معطل ہیں۔ باوجود اس کے کہ اکثر اعمال قبروں میں ثابت ہوتے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ کے آرام گاہ میں اذان اور اقامت کو دارمی اور قرآن شریف کی تلاوت ترمذی اور بخاری ﷫ نے انبیاء کے حج کو قبور میں روایت کیا ہے۔ اگر تفصیل چاہتے ہیں تو شرح الصدور مؤلفہ سیوطی ﷫ کا مطالعہ کیجئے۔ اسی طرح قرآن شریف میں طرفین احساس اور عدم احساس دونوں کا ابہام ہے۔ سورۃ یٰسین میں ارشاد ہے: ''من بعثنا من مرقدنا'' ترجمہ: (کس نے اٹھا دیا ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے) آیت دلالت کرتی ہے کہ قبور میں احساس نہیں ہے اور تمام سوئے پڑے ہیں اور دوسری آیت میں ارشاد ہے ''النار یعرضون علیھا غدوا وعشیا'' (المومن: ۴۶) (ترجمہ: وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو صبح وشام) یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ مردوں کو قبروں میں ضرور احساس ہے۔

میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی زندگی میں عمل کرنے والوں کے اعمال کے اختلاف سے برزخ کے حالات بھی مختلف ہیں۔ بعض اموات قبروں میں سوئے پڑے ہیں اور بعض اموات قبروں میں لذت اٹھاتے ہیں اور حدیث میں حیات برزخیہ کو نوم کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا ہے کہ لغت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو ٹھیک ٹھیک اس حال اور کیفیت کو ظاہر کردے جو برزخی حیات میں ہوتی ہے۔ باعتبار وضع لغت اس مضمر معنی کے ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لئے اس حیات برزخی میں حال اور کیفیت کے اظہار اور تفہیم کی غرض سے اس کی نظیر کے لئے جو لفظ موضوع تھا۔ اس کو حدیث نے ذکر اور بیان فرمایا۔ حیات برزخیہ کے ساتھ نوم سے زیادہ کوئی دوسری شئے مشابہ نہیں ہے۔

اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ''النوم اخو الموت'' موت کے مشابہ اشیاء میں سب سے زیادہ مشابہ اس کے نوم ہے۔ اس لئے قرآن شریف نے موت اور نوم دونوں کو ایک لفظ توفی کے تحت داخل کردیا ہے۔ پھر اس کے بعد قرآن شریف نے موت اور نوم میں فرق کردیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نوم اور موت میں بعض اشتراک ہے اور بعض امتیاز ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری'' (الزمر: ۴۲) ترجمہ: اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرایا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو)

غرض یہ کہ اس دنیا کی حیات کے انقطاع کا نام اور دوسری قسم کی حیات کی ابتداء کا نام برزخ ہے اور اسی طرح نوم میں بھی ایک گونہ اس دنیا سے انقطاع ہوتا ہے۔ (فیض الباری ج اوّل ص ۱۸۳)

غرض یہ ہے کہ قبر میں برزخی زندگی ضرور ہے۔ مگر وہ برزخی زندگی اس قسم کی زندگی ہے کہ اس کی سب سے زیادہ صحیح اور اس کی حقیقت کھولنے والی جامع تعبیر رسالت مآب کی زبان میں نوم ہے اور جیسے نوم من وجہ حیات ہے اور من وجہ موت ہے۔ اسی طرح برزخی زندگی میں فی الجملہ احساس ضرور ہے۔ مگر وہ اس قدر احساس ہے کہ اس پر حیات اور زندگی کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ برزخی زندگی میں اس درجہ احساس حیات اور زندگی کے اطلاق کے

لئے کافی اور موجب نہیں ہے۔ بلکہ وہ برزخی زندگی موت کے اس قدر قریب اور مشابہ ہے کہ نوم جو موت کے سب سے زیادہ قریب اور مشابہ ہے اور پیغمبرانہ فہم و دانست میں برزخی زندگی کے لئے نظیر ہے۔ اس لئے برزخی زندگی پر نوم کا اطلاق فرمایا گیا اور رسالت مآب ﷺ کی زبان میں بھی برزخی زندگی کا صحیح مفہوم اور جامع عنوان ہے۔

یہ زندگی ان اموات کی برزخی زندگی ہے جن کی قبور اعمال سے مملو ہیں اور جن قبور سے ان کے سکان بیت المقدس میں امام المرسلین اور نبی الانبیاء کے استقبال کے لئے نکلتے ہیں اور آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہونے کے لئے اور آسمانوں پر ملاقات کے لئے اپنی اپنی قبروں سے باہر آتے ہیں۔ ایسے نفوس قدسیہ کے لئے عالم برزخ میں رسالت مآب ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ وہ عالم برزخ میں ضرور ہیں۔ مگر برزخی زندگی میں نہیں۔ جیسے کہ عام اموات۔ جن کی قبریں اعمال سے معطل ہیں اور برزخی حیات میں سوئے ہیں۔ بلکہ عالم برزخ میں ان کی زندگی نماز، حج، اذان، اقامت وغیرہ اعمال کی زندگی میں اللہ کی عبادت سے لذت اٹھاتے ہیں اور دنیا کی زندگی جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔

عام اموات کی برزخی حیات کو حضور ﷺ کا نوم فرمانا اور عالم برزخ میں انبیاء علیہم السلام کو حیات اور زندہ بتلانا حضور ﷺ کی شہادت ہے کہ عالم برزخ میں انبیاء کی زندگی برزخی زندگی نہیں۔ بلکہ ان کی زندگی عالم برزخ میں ایسی جسمانی زندگی ہے جس میں نماز حج وغیرہ اعمال ادا کئے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ برزخی حیات حضور ﷺ کی زبان میں زندگی نہیں ہے بلکہ نوم ہے اور انبیاء کو قبروں میں زندہ بتلایا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہے کہ وہ برزخی حیات یعنی نوم کی زندگی طرح زندہ نہیں۔ بلکہ عملی دنیا کی زندگی کی طرح غیر معطل زندہ میں زندگی ہیں۔ شارع کی زبان میں برزخی حیات جس میں اعمال کرنے سے تعطل ہے اور انبیاء کی زندگی جس میں اعمال و قربات سے لذت اندوزی ہے دونوں الگ الگ قسم کی زندگی ہے اور اس کے معلوم کر لینے کے بعد انبیاء علیہم السلام کی حیات کے بارے میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تقریر پڑھئے۔

بخاری کتاب الصلوٰۃ باب رفع الصوت فی المسجد کی حدیث کی شرح میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو روایت کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی بیہقی کی تصحیح میں موافقت کی ہے کہ انبیاء زندہ ہیں، اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ حافظ کو اس حدیث کی مراد سمجھنے میں کچھ اشکال ہو گیا ہے کہ روح نفس حیات ہے۔ روح فنا نہیں ہوتی ہے۔ خواہ کافر کی روح ہے یا مؤمن کی، ارواح کل زندہ ہیں۔ اس کا معنی کیا ہے کہ انبیاء زندہ ہیں۔ سمجھو لو کہ یہ احادیث نفس روح کی حیات میں وارد نہیں ہیں۔ روح نے دنیا میں اپنی حیات کو پورا کر دیا۔ برزخ میں وہ اپنی دنیا کی حیات سے فارغ ہے۔ بلکہ یہ احادیث برزخ میں روح کے تعطل اور عدم تعطل افعال کی بحث میں ہدایت کرتی ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ارواح انبیاء علیہم السلام عالم برزخ میں عبادات طیبہ اور افعال مبارکہ سے معطل نہیں ہیں۔ بلکہ انبیاء اپنی قبروں میں بھی پاکیزہ افعال میں ایسے مشغول ہیں جیسا کہ دنیا کی زندگی، حج اور نماز وغیرہ عبادات میں مشغول تھے اور یہی حال علیٰ قدر مراتب ان کی اتباع کرنے والوں کا ہے اور جو لوگ اعمال طیبہ سے دنیا میں معطل تھے وہ قبر میں بھی ان سے معطل ہیں۔

''ومن کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاٰخرۃ اعمی'' (الاسراء: ۷۲) (ترجمہ: اور جو کوئی رہا اس جہان میں اندھا سو وہ پہلے جہان میں بھی اندھا ہے۔

اور اسی معنی مراد کی طرف حضور ﷺ نے اس ارشاد میں ''یصلون فی قبورھم'' اشارہ فرمایا ہے۔ انبیاء کے اس عمل کا ذکر فرما کر حضور ﷺ نے ان کی قسم حیات پر متنبہ کر دیا ہے کہ ان کی حیات کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں، حج کرتے ہیں، زندوں جیسے افعال کرتے ہیں وہ دنیا کی زندوں جیسی زندگی میں زندہ ہیں اور یہ عام عرف ہے کہ افعال سے معطل کو میت کہا جاتا ہے۔ اگر چہ وہ زندہ ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اصل حیات افعال حیات سے عبارت ہے اور افعال سے تعطل موت ہے۔ جیسا یہ عرف ہے کہ علم زندگی ہے اور جہل موت ہے اور اس تقریر سے ابوداؤد کی اس حدیث کی مراد بھی ظاہر ہوگئی۔ جس میں حضور ﷺ پر سلام پڑھنے کے وقت رد روح کا ذکر ہے۔ اس حدیث کے یہ معنی نہیں کہ رد روح میں حضور ﷺ زندہ کئے جاتے ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ حضرت الٰہیہ کی جانب سے سلام کے جواب کی جانب توجہ ہو جاتی ہے۔ زندگی دونوں جانب میں قائم تھی۔ نہ حضرت الٰہیہ کی میں موت تھی، تعطل تھا اور نہ سلام کے جواب کی جانب موت اور تعطل ہے۔ بلکہ سلام پڑھنے سے قبل حضرت ربوبیت کی جانب پوری توجہ تھی اور سلام پڑھنے کے بعد اس طرف کا تعطل اٹھ گیا جو پہلے تھا اور شغل پیدا ہوا۔ (فیض الباری ج ۲ ص ۶۵)

اس کی مزید تفصیل خیبر سے واپسی پر لیلۃ التعریس کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے یہ کی ہے کہ عام لوگ قبض روح کے معنی روح کے نکالنے کے سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی پوری حقیقت پر حافظ سہیلی رحمہ اللہ نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قبض قریب غط اور ضغط کے ہے۔ جیسا کہ بڑی اور موٹی پھولی ہوئی چیز کو آپ انگلیوں میں دبا دیں اور اس کا حجم کم ہو جائے۔ مثلاً روئی پھولی ہوئی ہے اور اس کو مٹھی میں کر لیں اور انگلیوں کو دبا دیں اور اسی قبض اور دبانے سے آپ اس کو صغیر کر دیں۔ جس کو ہندی میں بھینچنا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قبض ارواح کا معنی اس کو بعض افعال سے روکنے کے ہیں۔ جب کہ وہ جسم میں چلتی پھرتی حرکت کرتی تھی۔ پھر جب قبض کر لی گئی تو وہ روک لی گئی۔ بعض افعال سے جیسا کہ نوم میں ہوتا ہے۔ پس توفی اور ارسال آیت میں روح کے بعض افعال سے تعطیل اور اس کے رد سے عبارت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی نفس کی ایسی توفی کا ارادہ کرتا ہے جیسے میت کی توفی تو روح کو اس طرح قبض کرتا ہے جس کے بعد ارسال نہیں ہے تو وہ جن افعال میں مشغول تھی۔ ان سے معطل کر لی گئی اور اجساد سے باہر نکالی گئی۔

اس لئے کہ بالکلیہ تعطل کی یہی صورت ہے جب تک روح جسم کے اندر تھی تو ہمیشہ جسم کے اندر کسی نہ کسی تدبیر میں مشغول رہتی تھی اور جب جسم سے باہر نکال دی گئی تو جسم میں تدبیر سے بالکل روک دی گئی اور اب اس کو جسم کے ساتھ کسی قسم کی تدبیر کا تعلق نہیں رہا تو یہ بھی ایک قسم قبض ہے اور پورا قبض ہے اور یہی معنی ہے اس حدیث کا کہ سلام کے بعد حضور ﷺ کو روح رد کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ جناب قدس کی جانب مشغول تھی اور اب رد سلام کی جانب مشغول ہوگئی۔ اس کا معنی احیاء اور اماتت نہیں ہے۔ رد روح سے پیشتر بھی زندگی تھی اور اس کے بعد بھی زندگی۔ مگر التفات میں تبدیلی آگئی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عذر کرتے ہوئے حضور ﷺ سے یہ کہا تھا اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا

ہے تو تمہاری ارواح کو قبض کرتا ہے اور جب چاہتا ہے تم کو واپس کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فوت نہیں ہوئے تھے اور نہ اس کی روح اس کے جسد سے نکالی گئی تھی تا کہ رد روح کے معنی اس کا اعادہ لیا جائے۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ تمہاری ارواح بیداری کے کاموں سے روک دی گئی تھیں۔ اس لئے تم میں سے کسی کو جاگ نہیں آئی اور بیدار نہیں ہوا اور جب اللہ نے چاہا تو اس کو روک دیا تو جس طرح بیداروں کی ارواح مشغول ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ بھی مشغول ہوگئی اور پہلی جیسی قدرت اس کو حاصل ہوگئی۔ قبض روح کی یہی تعطل عن الافعال اصل حقیقت ہے۔ (فیض الباری ج ۲ ص ۱۴۴)

غرض یہ ہے کہ قبض ارواح موت اور انقطاع حیات کو مستلزم نہیں ہے اور نہ قبض ارواح کے معنی موت ہے اور نہ رد ارواح سے پیشتر موت ضروری اور لازم ہے۔ انبیاء کی حیات جب حدیث میں ذکر کی گئی تو اس میں نفس حیات صرف روح کی حیات نہیں ذکر کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ روح کی حیات خواہ کافر کی روح ہو بہرحال قائم ہے۔ روح کو فنا نہیں ہے۔ بلکہ حیات سے زائد حیات کے افعال کا اس میں جیسے حج، نماز وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ نفس حیات صرف روحانی حیات سے انبیاء علیہم السلام کی حیات کو الگ اور علیحدہ فرق کے ساتھ بیان کیا جائے کہ عام لوگوں کی حیات کی طرح ان کی حیات برزخی یا صرف روحانی حیات نہیں ہے۔ بلکہ ان کی حیات ایسی زندگی ہے۔ جس میں نماز اور حج اور قرآن کی تلاوت جیسے اعمال کئے جاتے ہیں اور ایسی زندگی ہے۔ جس میں بیت المقدس کا سفر اور آسمانوں کی سیر اپنے اجساد مقدسہ کے ساتھ کرتے ہیں اور وہ روحانی سیر وسفر اس لئے نہیں ہے کہ روح جسم کے اتصال کے بغیر حیات اور زندگی کا کوئی عمل نہیں کر سکتی ہے اور جب عالم برزخ میں انبیاء علیہم السلام کے یہ اعمال حیات صحیح ثابت ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء کی حیات جسمانی ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک!

تازہ واقعہ

آپ نے سابق اوراق میں پڑھ لیا ہے کہ سلف میں متعدد حضرات کو بیداری میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی دولت سے نوازا ہے اور یہ کہ اہل علم کو ارباب حقائق کے ساتھ اس فضیلت اور فوق العادت شرف میں پورا اتفاق ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے جس عاشق زار کے مخلصانہ اور صادق جذبات کو جب حق تعالیٰ خصوصی الطاف سے سرفرازی بخشتا ہے تو حق تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کے تقاضہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی عنایات اس پر مبذول ہو جاتی ہیں اور حق تعالیٰ اس حائل اور حجاب کو اٹھا دیتا ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی عزت وشرف سے بیداری کی حالت میں مانع رہتا ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مشفقانہ شان پیغمبرانہ رافت میں اس عاشق بے نواء کے والہانہ جذبات کی عزت افزائی اور قدردانی میں اس بے بہا دولت سے اس کو مالا مال اور مستفید فرماتے ہیں اور جس کے اقبال کا ستارہ چمکتا ہے۔ جس پر مہر نبوت کی شفقت کا سیہ پڑتا ہے۔ اس کو افضال خداوندی اور اکرام رسالت کا یہ بخرہ آج بھی ملتا ہے اور صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وعدہ اس سے پورا ہو جاتا ہے۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا ہے وہ عنقریب مجھے بیداری میں دیکھ لے گا۔

ارباب زہد وصلاح کے بے شمار واقعات اس کے ناقابل انکار شواہد ہیں۔ ہم آپ کو عالی مرتبت صاحب سعادت جناب نواب زادہ سعید اللہ خان صاحب کا تازہ واقعہ سناتے ہیں تاکہ آپ یہ سمجھ لیں کہ رسالت مآب ﷺ کے فوق العادت فیاضیوں اور اکرام نوازیوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور فریاد کناں کی آواز کو سنتے ہیں اور اس کی آرزو کو برلاتے ہیں اور شرف جواب سے تسلی فرماتے ہیں۔

نواب زادہ صاحب ۱۹۶۰ء ۱۷رنومبر بروز جمعرات پانچویں عمرہ کے لئے بیت اللہ شریف پہنچے۔ احرام عمرہ سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ جانے کا عزم کیا اور ۱۹رنومبر نو بجے صبح مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ جائے قیام سے اطمینان کے بعد حضور نبوت میں حاضری کے لئے حاضر ہوئے۔ مسجد نبوی میں تیغ وتفنگ کا مظاہرہ ہورہا تھا۔ نوابزادہ صاحب کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر تعجب کے ساتھ بے حد رنج ہوا کہ جلال نبوی اور عظمت رسالت کے سامنے یہ شاہی سیاست نمائی کیسی ہے۔

معلوم ہوا کہ ملک ابن سعود تشریف لائیں گے، میں حسب معمول روضہ نبوی کے پاس ریاض الجنۃ میں بیٹھا۔ کچھ دیر کے بعد سپاہی آئے اور وہاں بیٹھے ہوئے تمام حضرات کو اس لئے اٹھایا کہ اپنے لئے جگہ کردیں۔ میں بھی از خود اپنی جگہ سے یہ کہہ کر اضطرار اور بے اختیاری کے قلق میں اٹھا۔ اللہ کے پیارے رسول تجھ پر سلام اور اللہ تعالیٰ کی ہزار ہا رحمتیں ہوں تیرے دربار میں یہ آگے پیچھے کی ترتیب ریزرویشن کیسی ہے۔ طبیعت بے قابو تھی اور ٹپ ٹپ آنکھوں سے آنسو گررہے تھے اور نیازمندانہ گلہ تھا اور اپنی نسبت الفت کو اس اختیار میں ڈال دیا کہ آج اس غریب الوطن مشتاق کی محبت کی قدر اور قرب نبوی میں جگہ ملتی ہے یا حجاز کا امیر آگے بڑھایا جاتا ہے۔ اس والہانہ اور غیر شعوری جذبات میں یہ کلمات زبان سے نکل رہے تھے کہ اللہ کے شفیق ورحیم پیغمبر ﷺ کے حضور میں آج کس کو قرب نصیب ہوتا ہے۔ کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ یہ اعلان ہوا کہ ملک کی طبیعت ناساز ہے وہ نہیں آئیں گے۔ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جایئے۔ سپاہ چلے گئے اور میں اپنی جگہ بڑھا اور قرب نبوی میں بیٹھا۔

بیس نومبر دوسرے دن پھر وہی حال ہوا اور میں اپنے مقام سے پیچھے ہٹا، ملک تشریف لائے۔ مگر ان کی صفوں میں جگہ خالی رہ گئی اور مجھے اس میں آگے بڑھایا گیا، میری آرزو پوری ہوئی۔ تیسری روز اکیس نومبر دوشنبہ کے دن ممبر نبوی کے سامنے میں ظہر کی نماز سے پیشتر نفل پڑھ رہا تھا۔ اچانک ممبر نبوی میں غیر معمولی تیز روشنی ہوئی، غیر اختیاری طور پر میری نگاہ اوپر کو اٹھی۔ واہ خوش بختی کہ جمال جہاں آراء رسالت مآب ﷺ کے مقدس پیغمبرانہ چہرہ کی زیارت سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہیں اور پیغمبرانہ شفقت ورافت کے لہجہ میں فرمایا: سعید اللہ! تم نے کیا کہا تھا کہ مجھے تو پیارا ہے یا ابن سعود لاڈلا ہے۔ تیرے دل میں گلہ تھا کہ میرے قرب میں جنت کے ٹکڑے میں تجھے جگہ نہیں ملتی تھی۔ ملک کا اپنا مقام ہے مگر نبوت کا دامن اپنے دیوانوں کو اپنے اندر رکھتا ہے۔ جس کے سر پر رافت نبوت کا ہاتھ اور لطف رسالت کا سایہ ہے اس کو اپنے مقام پر چھوڑتا ہے۔

نواب زادہ صاحب کا بیان ہے کہ میری آنکھیں ندامت سے نیچے ہوئیں اور بے خودی کی کیفیت تھی۔ حضور ﷺ کی آواز کے سوا کسی دوسرے کی آواز نہیں سنتا تھا اور حضور ﷺ کے جمال کے سوا کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ تمام

حواس کا شعور وتعقل صرف اس ایک جہان آراء کے رخ پر جما ہوا تھا۔ کچھ احساس ہوا تو میں سجدہ میں تھا۔ اس کے بعد قعدہ پر بیٹھا مگر کچھ جانتا سمجھتا نہیں تھا کہ کیا کر رہا ہوں اور کیا پڑھ رہا ہوں۔ سلام پھیرا تو نقشہ اور تھا۔ ایک طرف روضہ اطہر ہے اور دوسری طرف لوگ بیٹھے ہیں۔ اس سرفرازی کے حال کے بدل جانے اور آنکھوں سے حضور ﷺ کے دور ہو جانے کے بعد آج تک جو میرے قلب کو صدمہ ہو رہا ہے۔ نہ کبھی پہلے ہوا اور نہ آئندہ اس کا خطرہ ہوتا ہے اور آج بھی جب نواب زادہ صاحب یہ واقعہ بیان کرتے ہیں تو بار بار آب دیدہ ہوتے ہیں اور آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

یہ اکیس نومبر ۱۹۶۰ء کے حال کا واقعہ ہے اور ایسے مخلص، بے لوث مسلمان کبیر شخصیت کا واقعہ ہے کہ بچپن سے طبیعت کا محتاط، زبان کا سچا، شب بیدار، صوم وصلوٰۃ کا پابند، ذہن وضمیر کا روشن، علم پرور، علماء کا عقیدت مند، اخلاق کا پاکیزہ، اعمال سنت میں بہتر، معاملات میں صاف اور ستھرا، کار ہائے حکومت اور فصل خصومات میں انصاف ودیانت کا پیکر، خدا کا خوف، مخلوق خدا کی خیر خواہی، انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ امور نواب زادہ صاحب کے خصوصی فضائل ہیں۔ جس کی تمام زندگی دنیا کی نعمتوں اور تمام قسم کی سہولتوں میں گزرنے کے باوجود دین میں استقامت پر متمکن اور متنبہ رہتے ہیں اور بار بار بیت اللہ کی زیارت کے سفر سے اس کا مقصد وحید صرف اللہ کے گھر کی برکات اور بیت نبوت کے فیوض حاصل کرنے اور سمیٹنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی فیاضیاں اور الطاف رسالت کی سرفرازیاں نہ کسی حد پر ختم ہوتی ہیں اور نہ کسی عہد اور گروہ کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ بلکہ جس نے بھی صمیم قلب مخلصانہ شوق عقیدت اور والہانہ جذبہ سے ادھر کا رخ کر لیا ہے تو وہ حق تعالیٰ کی فیاضیوں اور حضور ﷺ کے بے پایاں الطاف سے دامن بھر کر واپس ہوتا ہے اور خوش بخت نعمتوں سے مالا مال ہو کر لوٹتا ہے۔

ای کہ چشم تو در عین بیداری مگر از جمال مصطفیٰ شد بہرور

ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے فضائل کے واقعات بیداری ہر سال اور بکثرت نفوس قدسیہ کو نصیب ہوتے ہیں۔ مگر جن حضرات کو اسرار الٰہیہ کا حظ نصیب ہے وہ خاموش رہتے ہیں اور راز داری رکھتے ہیں اور جن خوش نصیبوں کو تحدیث نعمت کی شان نصیب ہوتی ہے وہ بیان کرتے ہیں۔

حضرات! یہ ایک پاک سرشت اور نیک نفس مسلمان کا سچا اور صحیح واقعہ ہے اور حضور ﷺ کی دنیاوی حیات جیسی حیات کا نیا گواہ ہے۔ اس پر کسی کو یہ تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ دربار رسالت میں نواب زادہ صاحب کو الطاف نبوی کا یہ عظیم شرف روز روشن کا واقعہ ہے اور دوسرے حضرات بھی وہاں موجود ہیں۔ ان کے سامنے یہ حال اور واقعہ کیوں ظاہر نہیں ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ غیب کے اسرار جس پر حق تعالیٰ چاہتا ہے کھول دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ اس کی بنیاد اور منشاء اللہ کی حکمتیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو وحی آتی تھی اور پوشیدہ طور پر اندر اندر آتی تھی حضور ﷺ کے وجود سے باہر کوئی علیحدہ ہستی نظر نہیں آتی تھی۔ جبرائیل وحی لے کر آتا تھا۔ حضور ﷺ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اس وقت بیٹھنے والے بیٹھے ہوتے تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی اس حال میں نہ فرشتہ کو دیکھا اور نہ اس وحی کو سمجھا۔ انبیاء علیہم السلام بیداری میں اپنی آنکھوں سے مغیبات کو

دیکھتے ہیں اور ہمیں اس وقت بھی ان مغیبات کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ امت کے اولیاء اپنے کشف میں اپنی آنکھوں سے بہت امور اشیاء دیکھ لیتے ہیں۔ مگر ہم سے اس وقت بھی وہ امور محجوب ہوتے ہیں۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب لطائف المنن والاخلاق میں لکھتے ہیں۔ مجھ پر حق تعالیٰ کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ میں حضور رسالت مآب ﷺ کے قریب ہوتا ہوں اور میرے اور آرام گاہ نبوت کے درمیان کی مسافت کھینچ جاتی ہے اور فاصلہ دور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میرا ہاتھ حضور ﷺ کے مقصورہ پر ہوتا ہے اور یہ حال اس وقت ہوتا ہے جب کہ میں مصر میں بیٹھا ہوا ہوتا ہوں اور میں حضور ﷺ سے اس طرح باتیں کرتا ہوں جیسا کہ ایک انسان اپنی مجلس میں اپنے جلیس سے باتیں کرتا ہے اور یہ تعلق اور معاملہ وہ شخص جانتا ہے جس کو اس کا ذوق ہے۔ جس کو یہ پیش آیا ہے اور پیش آتا ہے۔ اور جس کو یہ ذوق نہیں ہے جس کو یہ پیش نہیں آیا ہے اور پیش نہیں آتا ہے وہ اس کا انکار کرتا ہے۔ بعض حضرات اولیاء ایک شیخ کے مناقب میں گفتگو کرتے تھے اور اس مجلس میں ایک فقیر بیٹھا ہوا۔ اس شیخ کے مناقب سن رہا تھا اور جو صاحب شیخ کے مناقب بیان کر رہے تھے وہ اپنی کرسی سے نیچے اترے اور اس فقیر کو جو زہد وصلاح میں معروف تھے مارا اور اس کے سر پر تین ضرب لگائے۔ اس پر مجلس کے حاضرین نے برا جانا اور اپنے شیخ پر انکار کیا۔ ان کو جواب دیتے ہوئے شیخ نے فرمایا کہ اس فقیر کو قسم دے کر اس سے پوچھو کہ جب میں شیخ کے مناقب بیان کر رہا تھا تو اس نے اپنے دل میں یہ نہیں کہا کہ وہ اس شیخ سے بہتر ہے۔ جس کے مناقب میں بیان کر رہا تھا تو اس فقیر نے کہا: ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میں اپنے دل میں ایسا کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد مناقب بیان کرنے والے صاحب نے فرمایا کہ اس دیوار میں سے اس شیخ نے جس کے مناقب بیان کئے جاتے تھے اپنا سر باہر نکالا اور مجھ سے کہا دیکھو یہ فقیر کس قدر میری گستاخی اور بے ادبی کرتا ہے۔ اس لئے اس کی تادیب کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ الخ!

اسی مجلس میں مناقب بیان کرنے والے صاحب کے علاوہ دوسرے حضرات بھی شریک تھے۔ مگر اس دیوار میں سے شیخ کا باہر سر نکالنا کسی اور نے نہیں دیکھا۔ اللہ کی شان اور اس کی مشیت ہے جس پر وہ چاہتا ہے غیب کو کھولتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی حیات میں اگر علماء کو اختلاف ہے تو صرف اس قدر ہے کہ حضور ﷺ کو جب موت عارض ہوئی تھی اس نے حضور ﷺ کی حیات کو منقطع کیا تھا یا اس وقت بھی موت کے پردہ کے نیچے حیات قائم تھی۔ ہر ایک فریق کا الگ فکر ہے اور اس کی وجوہات ہیں اور ہر ایک فریق دوسرے فریق کی وجوہات میں تاویل و توجیہہ کرتا ہے۔ مگر عالم برزخ میں حضور ﷺ کی جسمانی اور دنیا کی حیات جیسی حیات پر امت کے جمہور علماء کا اتفاق ہے۔

بقول شیخ عبدالحق تین چار علماء کے سوا امت مسلمہ کے تمام اکابر علماء نے حضور ﷺ کی جسمانی حیات کو تسلیم کیا ہے اور عالم برزخ میں حضور ﷺ کی برزخی اور روحانی حیات کو حضور ﷺ کے لئے کوئی خصوصیت اور فضیلت نہیں سمجھتے ہیں اور یہی اکابر علماء دیوبند کا مسلک ہے۔ جس کو دیوبند کے علماء نے بار بار اور جگہ جگہ واضح اور با تفصیل لکھ دیا ہے۔ والحمدللہ علی ذلک!

امین الحق خطیب جامع مسجد شیخو پورہ متوطن طورو ضلع مردان

رجب المرجب ۱۳۸۰ھ